U33055 P. 2

Title – JADEED FALSAFA TALEEM.

Creator – Zia uddin Ahmad Allahabad

Publisher – Matba Anwaar Ahmadi (A

Date – 1941

Pages – 122

Subject – Taleem – Falsafa ; Falsa

Taleem

جدید فلسفۂ تعلیم پر ماہرین تعلیم کی رائیں

انتساب

میں اپنی اس ناچیز تصنیف کو بحسن عقیدت و بنظر تبریک اپنے نانا صاحب جناب قبلہ الحاج مولانا محمد محی الدین صاحب جعفری الزینبی رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں جن کے تبحر علمی اور حسن اخلاق نے اس ناچیز کو ابتداءً ضیاء علمی سے روشناس فرمایا۔

ضیاءالدین احمد الہ آبادی

The opinion of Lt-Col. Dr. Sir Ziauddin Ahmad, Vice-Chancellor, Muslim University Aligarh on Mr. Ziauddin Ahmad's book "New Educational Philosophy":—

It is an interesting booklet on the principles of education and the author has attempted an exposition of the educational philosophy of John Dewey.

The terminology used by the author requires improvement here and there and the world wide influence of the great educationist should have received some attention by the writer, specially his influence on the theory and practice of Indian Education.

There is a good scope for such books in the Urdu language and the book should be well received in the educational circles.

ZIAUDDIN AHMAD

Vice-Chancellor,

Muslim University, Aligarh.

لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد - ایم - ایس - سی ' ڈي - ایس - سی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹي - علیگڈھہ کي انگریزي تحریر کا ترجمہ :—

اُصول تعلیم پر یہہ ایک دلچسپ کتاب ھے اور مصنف نے جان ڈیوی کے فلسفۂ تعلیم کی توضیح و تشریح کي ھے -

مصنف نے جو اصطلاحات استعمال کئے ھیں اُن میں جابجا ردوبدل کي ضرورت ھے اور مصنف کو اس بڑے فلسفي کے عالمگیر اثر کي طرف بھي توجہ کرني چاھئے تھي جس نے تعلیمي دنیا میں اور خاص کر ھندوستاني تعلیم کے نظریہ اور عمل پر اثر ڈالا ھے -

اُردو زبان میں اس قسم کي کتاب کے لئے عمدہ وسیع میدان ھے اور تعلیمي حلقوں کو چاھئے کہ اس کتاب کي اچھي طور پر قدر و منزلت کریں -

ضیاءالدین احمد

وائس چانسلر - مسلم یونیورسٹي - علیگڈھ

۲۵ - اپریل سنہ ۱۹۳۲ع

The opinion of Prof. Amaranatha Jha M.A., Vice-Chancellor of Allahabad University on Mr. Ziauddin Ahmad's book the "New Educational Philosophy."

MITHILA,
George Town,
Allahabad.

January 20, 1942.

Dear Mr. Ziauddin,

I looked into your book on New Educational Philosophy and read it through with much pleasure. I think you have succeeded in producing a valuable work which should win warm approval from all lovers of Urdu. I do not remember to have come across any such well informed and comprehensive work on the subject in Urdu.

Wishing you all success.

I am,
Yours sincerely,
AMARANATHA JHA.

(پروفیسر امرناتهہ جها - ایم - اے - وایس چانسلر الہ‌آباد یونیورستی کی انگریزی تحریر کا ترجمہ) -

متهیلا - جارج ٹاون - الہ‌آباد - ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع

ڈیر مسٹر ضیاءالدین -

میں نے آپ کی کتاب "جدید فلسفہ تعلیم" دیکھا اور اُسکو پڑھکر بیحد خوش ہوا - میری دانست میں آپ اس مفید اور قیمتی کتاب کے تصنیف کرنے میں کامیاب ہوے ہیں اور (مجھے اُمید ہے) کہ اس کو تمام شایقین اُردو بے حد پسند کرینگے - مجھے یہہ یاد نہیں آتا کہ میں نے اب تک کوئی ایسی مکمل اور جامع کتاب اُردو زبان میں اس موضوع پر دیکھی ہے - میں دل سے کامیابی کا خواہاں ہوں -

آپ کا مخلص

امرناتهہ جها

The opinion of Dr. Tara Chand, M. A. (Alld.), D. Phil (Oxford) Principal, K. P. University College, Allahabad on Mr. Ziauddin Ahmad's book "New Educational Philosophy."

Among philosophers of education John Dewey holds a position of great eminence. His thought has exercised a profound influence upon educational theory and practice. The purpose of education as Dewey sees it is "to so reconstruct the pattern of our life and institution as to give to each individual an effective participation in and some measure of control over the corporate and social structures that surround him." He finds that in the present world the situation is so bewildering that the individual is simply a lost soul. He lacks solid and assured objects of belief and approved ends of action and his life is one of "unrest, impatience, irritation and hurry". Outwardly the individual is a member of the great society, but the social machine has so regimented him that he has become qualified and standardized. The loss of individuality has resulted in a collectivity which is no true community

How to remove the conflicts which exist between the conditions created by the advance

of science and industry and the prescientific pretechnological ideals and values which still dominate the minds of the individual, and how to restore the harmony between society and individual in a world situation which is dynamic is the real problem of education.

Dewey has devoted the energies of his powerful intellect to the solution of this problem. We in India find ourselves in a situation similar to the one analysed by Dewey. It has created an acute conflict both within the individual and within society. The ideas of Dewey are therefore of profound interest to us.

I congratulate Mr. Ziauddin Ahmad for the laudable effort he has made to acquaint the Urdu reading public with the main principles of the new philosophy of education which has been transforming the educational systems of America and Europe.

I am sure a study of this book which discusses both the fundamental theories of Dewey's philosophy and their application to education, will prove of much value to teachers of our school.

Tara Chand.

February 1, 1942.

(ڈاکٹر تارا چند ایم - اے - ڈي - فل (آکسفورڈ) پرنسپل
کے - پی - یونیورسٹي کالج الہ آباد کي انگریزي تحریر کا
ترجمہ) -

تعلیمي فلسفوں میں جان ڈیوي بہت هي ممتاز درجہ رکھتا هے اس کے خیالات نے تعلیمی نظریہ اور عمل پر بہت گہرا اثر ڈالا هے - ڈیوي کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہہ هے کہ "همارے زندگي اور اداروں کے نمونے (تمثیل) کي اس طرح از سر نو تشکیل هو کہ هر فرد کو ان اجتماعی و سماجي نظام (Structures) میں موثر اشتراک عمل کا موقع ملے جو اس کو گھیرے هوئے هیں اور نیز وہ کسي حد تک اس پر اقتدار حاصل کرے" - وہ دیکھتا هے کہ موجودہ دنیا میں حالات اس قدر پریشان کن هیں کہ فرد صرف ایک گم شدہ روح هے - اس میں مستحکم اور یقیني اشیاء کا ایمان اور پسندیدہ انجام کا عمل مفقود هے' اور اس کي زندگي حرکت' اضطراب' بے چیني اور سرعت کے مجموعے کا نام هے - بظاهر هر فرد بڑے معاشرہ کا ممبر هوتا هے لیکن سماجي قوتوں نے اس کو اس طرح منظم کیا هے کہ وہ باکمال اور معیاري بن گیا هے - انفرادیت کے فنا هونے سے اجتماعیت کا ظہور هوا هے جو حقیقي قومیت (Community) نہیں هے -

تعلیم کا حقیقي مسئلہ یہہ هے کہ اُن اختلافات کو جو سائنس اور صنعت و حرفت کي ترقي کے حالات سے اور

قبل از سائنس و قبل از صنعت و حرفت کے نصب العین و قدر و قیمت سے پیدا ہوے ہیں اور اب تک افراد کے دماغوں پر مسلط ہیں کس طرح ہٹایا جاسکتا ہے ' اور نیز بین الاقوامی حالت میں جو تغیر پذیر ہو سماج اور فرد کے درمیان کس طرح توازن قائم کیا جاسکتا ہے -

ڈیوی نے اپنی زبردست اور موثر ذکاوت کی قوتوں کو اسی مسئلہ کے حل کرنے میں صرف کیا ہے - ہم اپنے ملک ہندوستان میں بھی وہی حالت پاتے ہیں جس کی تشریح ڈیوی نے کی ہے اس نے (حالت) فرد اور سماج کے اندر ایک زبردست تصادم و کشمکش پیدا کردیا ہے - اسی وجہ سے ڈیوی کے خیالات ہمارے لئے بے حد دلچسپ اور موزوں ہیں -

میں مسٹر ضیاءالدین احمد کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنی قابل ستائش محنت سے اُردو داں طبقے کو جدید فلسفہ تعلیم کے ان اہم اُصولوں سے روشناس کرنے کی کوشش کی ہے جو امریکہ اور یورپ کے نظام تعلیم میں انقلابات رونما کررہے ہیں -

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ جس میں فلسفہ ڈیوی کے بنیادی نظریوں اور ان کے تعلیمی عمل سے بحث کی گئی ہے ہمارے اسکول کے اساتذہ کے لئے بے حد مفید اور قابل قدر ثابت ہوگا -

تارا چند

یکم فروری سنہ ۱۹۴۲ ع

(ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم - اے - پی - ایچ - ڈی
(برلن) - پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی کی راے) -

صدر دفتر — جامعہ ملیہ اسلامیہ - دھلی
جامعہ نگر

۸ - فروری سنہ ۱۹۳۲ ع

ضیاءالدین احمد صاحب کی کتاب " جدید فلسفہ تعلیم " ... میں نے پڑھی - اس مختصر سی کتاب میں مصنف نے جدید فلسفہ تعلیم کے اھم خیالات خصوصاً ڈیوی کے تعلیمی مسائل کا نچوڑ پڑھنے والوں کے لئے فراھم دیا ھے - ھمارے بے شمار اُستاد ان خیالات کو اصل کتابوں میں نہیں پڑھ سکتے - اس لئے یہہ ایک مفید تعلیمی خدمت ھے -

ذاکر حسین

(خواجہ غلام السیدین صاحب بی - اے (علیگ)
ایم - اي - ڈي (لیڈز) ڈائرکٹر تعلیمات، ریاست کشمیر کي
راے " جدید فلسفہ تعلیم " پر :—

میں نے جناب ضیاءالدین احمد صاحب بي - اے
بي - ٹي (علیگ) کی تصنیف " جدید فلسفہ تعلیم "
کو دلچسپي کے ساتھہ پڑھا - اس کتاب میں اُنھوں نے
فلسفہ تعلیم کے بہت سے اهم پہلوؤں پر بحث کی ھے جن کا
مطالعہ ھندوستان کے معلموں کے لئے یقیناً مفید اور
دلچسپي کا باعث ھوگا - اس بحث کے دوران میں اُنھوں نے
خاص کرکے امریکہ کے مفکر اعظم پروفیسر ڈیوی کے خیالات
کو تفصیل کے ساتھہ پیش کیا ھے - چونکہ تمام مغربي
ممالک کے تعلیمی خیالات اور تعلیمی نظام پر ڈیوی کا نہایت
گہرا اور دور رس اثر پڑا ھے اور ابھی تک اُردو زبان میں
ڈیوي کے فلسفہ تعلیم کے بارے میں کوئي چیز نہیں لکھی
گئي لہذا یہہ کتاب اس لحاظ سے قابل قدر ھے کہ وہ اُردو
داں حضرات کو ان کے فکري رجحانات سے روشناس
کرتي ھے -

مجھے اُمید ھے کہ جب اس کتاب کی دوسری اشاعت
کی نوبت آئے گي تو قابل مصنف اس کو زیادہ مفید بنانے

کے لئے فلسفہ تعلیم کے عام اُصولوں نے تعلیمی نتائج کو زیادہ واضح کردیئےگئے اور اس کو ایک زیادہ وسیع حلقے میں مقبول کرانے کی خاطر زبان کو زیادہ سادہ اور سلیس بنانے کی کوشش کریں گے - اُمید ہے کہ ان کی یہہ کوشش معلموں کی نظر میں قبولیت حاصل کرے گی اور وہ اپنی تعلیمی دلچسپیوں کو جاری رکھکر اُردو زبان میں مفید تعلیمی کتب کا اضافہ کریں گے -

خواجہ غلام السیدین

علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری کی رائے :—

میں نے کتاب مسمول " جدید فلسفہ تعلیم " مصنفہ عزیزی مسٹر ضیاءالدین احمد بی - اے - بی - ٹی پڑھی - فلسفہ تعلیم پر یہہ بڑی عمدہ کتاب ہے اور اس میں تعلیم کے ماہرین کے خیالات کو بڑے دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے خاص کر جان ڈیوی کے خیالات کو جو زمانہ حال کا بڑا تعلیمی ماہر اور فلسفی ہے - جن لوگوں کو علم اور تعلیم سے ذوق ہے وہ اس کتاب کو شروع کرنے کے بعد بلا ختم کئے چھوڑ نہیں سکتے -

معلم کے لئے یہہ ضروری ہے کہ وہ علم نفسیات سے آشنا ہو تاکہ وہ دیکھے کہ کن کن چیزوں کا اثر لڑکے پر ہوتا ہے اور کس قسم کی تعلیم اس کے لئے مفید ہوگی - اس کا دور حالیہ میں بہت خیال کیا گیا ہے ایسے اصولوں سے اب انسان تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت سی ایسی چیزیں استعمال کرتا ہے جس میں سے کچھہ اپنی بنائی ہوئی ' کچھہ قدرت کی عطا کی ہوئی ہیں - اس لئے اب تعلیم ' فطرت کے زیادہ مطابق ہوگئی ہے اور اسی کے ساتھہ زیادہ مفید بھی ہوگئی ہے -

موجودہ طرز تعلیم میں صرف یہہ نقص ہے کہ معلم تجارتی اصول پر کام کرتے ہیں اور وہ جذباتی تعلق جو گرو اور چیلا اور اساتذہ اور تلامذہ میں پہلے ہوتا تھا وہ مفقود

ہوگیا - اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ معلم اپنی ذاتی ذمہ داری متعلم پر نہیں سمجھتا جو پہلے ضروری سمجھی جاتی تھی - موجودہ معلم کی نظر روپیہ پر ہوتی ہے اور قدیم معلم کی نظر خدمت پر ہوتی تھی جو جمہوریت کی بنیاد ہے -

اس کتاب کے پڑھنے سے بنیادی اصول آسانی سے سمجھہ میں آسکتے ہیں اور اس پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے کہ تعلیم میں جمہوریت کیسے پیدا ہوتی ہے -

میں مسٹر ضیاءالدین احمد کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ بہت مفید کتاب اُردو داں پبلک کے سامنے لائے ہیں اور اردو ادب کے خادم کی حیثیت سے میں اُن کا شکرگزار ہوں کہ اُنہوں نے ایک قیمتی جوہر کا اس میں اضافہ کیا ہے -

(علامہ ڈاکٹر) سید نجم الدین احمد جعفری

(بیرسٹر ایٹ لا)

فاطمہ اسٹیٹ - الہ آباد

۱۲ - مارچ سنہ ۱۹۳۲ع

The opinion of Khan Bahadur Dr. Ibadur Rahman Khan, Ph. D., (London), Principal, Basic Training College, Allahabad on Mr. Ziauddin Ahmad's book 'New Educational Philosophy'.

I have read Mr. Ziauddin Ahmad's book "New Educational Philosophy" with great pleasure. It is an interesting and valuable book on education and the author has discussed the broad principles of new educational philosophy with success.

During the course of his discussions the author has exhaustively dealt with the democratic conception of educational philosophy of John Dewey, the modern philosopher and educationist of outstanding eminence.

I congratulate Mr. Ziauddin Ahmad on producing such a learned book in Urdu which will surely serve as a good guide to teachers and lovers of edacation in India, and hope that he will continue his literary pursuits in future.

(Sd.) I. R. Khan,

28. 5. 42.

PRINCIPAL, BASIC TRAINING COLLEGE,
ALLAHABAD.

خان بہادر ڈاکٹر عبادالرحمان خاں - پي - ایچ - ڈي (لندن) پرنسپل بیسک ٹریننگ کالج الہ آباد کي انگریزی تحریر کا ترجمہ :—

میں نے مسٹر ضیاءالدین احمد کي کتاب "جدید فلسفہ تعلیم" کو بڑي مسرت کے ساتھہ پڑھا - یہہ تعلیم پر ایک دلچسپ اور قابل قدر کتاب ھے - مصنف نے جدید فلسفہ تعلیم کے اھم اُصولوں پر کامیابي کے ساتھہ بحث کي ھے -

فلسفہ تعلیم کے بحث کے دوران میں مصنف نے جان ڈیوي کے جمہوری نظریہ تعلیم کو تفصیل کے ساتھہ پیش کیا ھے جو موجودہ دنیا کا بہت ھي ممتاز اور معروف فلسفي و معلم ھے -

میں مسٹر ضیاءالدین احمد کو مبارک باد دیتا ھوں کہ اُنھوں نے ایک ایسی عالمانہ کتاب اُردو زبان میں تصنیف کي ھے جو یقیناً معلمین اور شائقین علم کے لئے شمع ھدایت کا کام دیگي اور مجھے اُمید ھے کہ وہ اپنے علمي و ادبی مشاغل کو برابر جاری رکھیں گے -

آئی - آر - خان
۲۸ - مئي سنہ ۱۹۴۲ع



ضیاءالدین احمد الہ آبادی

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U33055

۳۴

جدید فلسفۂ تعلیم

(جس میں زیادہ تر ڈیوی کے فلسفۂ تعلیم سے بحث کی گئی ہے)

از

ضیاء الدین احمد الہ آبادی

بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

CHECKED 2002

سید عبدالواسع جعفری کے اہتمام سے

مطبع انوار احمدی الہ آباد سے چھپکر شائع ہوئی

قیمت فی جلد مجلد عمر غیر مجلد ۱۰/

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	مقدمہ	
(۱)	تعلیم کی تعریف	۷
(۲)	تعلیم اور قوم	۱۰
(۳)	نصاب	۱۳
(۴)	اسکولی حکومت	۲۲
(۵)	سزا	۲۴
	باب اول	
	ڈیوی کا نظریہ تعلیم	
(۱)	سوانح حیات	۲۶
(۲)	نظریۂ عملیت	۲۷
(۳)	تخلیقی جمہوریت	۲۹
(۴)	تجربہ کی مسلسل تعمیر نو ..	۳۶
(۵)	عمرانی و اجتماعی تنظیم نو ..	۴۸
(۶)	حیات امروزہ کی اہمیت ..	۵۱
(۷)	تدوین نصاب	۵۸
	باب دوم	
	ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر	
(۱)	مرکزیت طفل	۶۴
(۲)	تعلیم اور تجربہ	۶۹
(۳)	شوق و کوشش	۷۱
(۴)	سماجی ادارہ	۷۳
(۵)	اخلاقی تعلیم	۷۵
(۶)	سماجی لیاقت و صلاحیت ..	۸۱
	باب سوم	
(۱)	تخلیقی ذہنیت کیا ہے؟ ..	۸۶
	باب چہارم	
	با مقصد و مفید تعلیم کا نظریہ	
(۱)	ووکیشن کی تاریخ	۹۹
(۲)	ووکیشن کا مفہوم	۱۰۱
(۳)	ووکیشن کی اہمیت	۱۰۳
(۴)	موجودہ مواقع و خطرات ..	۱۰۷
(۵)	منصبی و افادی تعلیم پر تاکید ..	۱۰۹
	باب پنجم	
(۱)	جان ڈیوی کے فلسفہ کا ماحصل	۱۱۴

دیباچہ

علم وہ جوہر ہے جس کی تلاش اور جستجو میں لوگ مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کرتے ہیں۔ یہ وہ بیش بہا خزانہ ہے جس کے جمع کرنے کے لئے لوگ عزیز و اقارب، دوست و احباب کو چھوڑ کر منبع علم کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ سرچشمہ ہے جس سے پیاس بجھانے کے لئے تشنگان علم کو محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اسی تحصیل علم کے لئے مسلمانوں نے چین سے آئیس لینڈ تک کی سیر کی اور مشرق و مغرب میں وہ دارالعلوم قائم کئے جن کی روشنی سے یورپ کی تاریک فضائیں منور ہوئیں۔ قرطبہ، غرناطہ، الازہر و بغداد وغیرہ وہ تعلیمی سرچشمے تھے جن سے صدہا نہریں نکلیں اور ہزاروں انسانوں نے علم کی پیاس بجھائی، اور کندی، فارابی، ابن بیطار، امام رازی، بوعلی سینا، ابن رشد وغیرہ جیسی ہستیاں پیدا کیں۔ اسی جذبہ کے ماتحت یورپ کی بڑی بڑی ہستیوں نے نامعلوم ممالک کے دریافت کی سعی کی۔ اور بحر زخار میں مصائب و آلام برداشت کر کے گنجینۂ علم کو مالامال کیا۔ اگر ایک طرف نیوٹن، ڈارون، آئینسٹائن نے اپنے نظریہ کشش، نظریہ ارتقاء اور نظریہ اضافیت سے انسانی علوم میں اضافہ کیا ہے، تو دوسری طرف کولمبس، ڈریک، واسکوڈی گاما، کیپٹن کک، اسکاٹ وغیرہ نے اپنے بحری و بری سفر سے نئے ممالک اور نئے راستوں کا انکشاف کیا ہے۔

اس طرح مشرق و مغرب کے بہترین دماغوں نے اپنی بساط کے مطابق چمنستان علم میں رنگ برنگ کے پھول سجائے ہیں اور انواع و اقسام کے خوشبوؤں سے تمدن انسانی کو معطر کرنے کی کوشش کی ہے۔ الغرض ہر عہد اور ہر زمانہ میں قوموں اور ملکوں نے "ارتقائے تمدن انسانی" کو اوج کمال تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں تعلیم کا صحیح مقصد صرف چند کتابوں کا پڑھ لینا اور کسی کالج اور یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لینا خیال کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقی تعلیم وہ ہے جو ایک انسان کو اس قابل بنائے کہ وہ فطرت اور انسانیت کا مطالعہ کر سکے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے آپ کو کامیاب بنا سکے۔ اس کے اندر جمود کے بجائے حرکت، سکون کے بجائے جنبش، مایوسی کے بجائے امید، تاریکی کے بجائے روشنی اور غلامی کے بجائے آزادی کے جذبات موجزن ہوں۔ اور وہ دنیا کے مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے میں عزم و ثبات، استحکام و استقلال اور حکمت و دانائی سے کام کرے اور اس میں سوسائٹی کے لائق ممبر بننے کی کامل صلاحیت موجود ہو۔ وہ اس طرح اپنی زندگی کو درست کر سکے کہ ماحول اور سوسائٹی کی برائیوں کو مفید اصلاحات میں تبدیل کر دے تاکہ ملک اور قوم کی ترقی کافی سرعت کے ساتھ جاری رہ سکے۔

علم کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم بچے کی نفسیات اور اس کے فطری رجحانات کا بغور مطالعہ کریں اور اس کی جبلی خواہشات کو پوری طرح

سمجھیں۔ اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ بچّوں کی نفسیات کے مطالعہ کے بعد اُن کو موزوں اور صحیح تعلیم دیں، اور اُن کی جبلّتوں کو بہتر اور مفید راستے پر لگانے کی کوشش کریں۔ اس انسانی تعمیر میں کافی محنت و مشقت کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن یہی تعلیم کا صحیح راستہ ہے، اور اسی پر عمل کرنے سے آزاد اور خود اعتماد شہریوں کی تشکیل ہو سکے گی۔ جب تک ہم بچوں کے تعلیمی ماحول میں آزادی اور اصولِ انسانیت کو مروج نہ کریں گے اور اُن کی مخفی قوتِ ایجاد و اختراع کو نہ اُبھاریں گے اُس وقت تک ہمارا ملک ٹیگور، اقبالؔ، رامن جی اور بوس جیسی ہستیاں نہ پیدا کر سکے گا اور ترقی کے میدان میں متمدّن اقوام کے دوش بدوش نہ کھڑا ہو سکے گا۔

ہم نے اس کتاب کے لکھنے میں جدید تعلیمی نظریوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ہمارا مقصد اس کتاب کے شائع کرنے سے یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں جدید اصولِ تعلیم پر عمل کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے موجودہ مفکرین میں سے ایک ایسی ہستی کا انتخاب کیا ہے جو بحیثیت معلّم اور ماہر نفسیات کے نہایت ہی جامع شخصیت ہے یعنی حکیم جان ڈیوی، جس کی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" تعلیمی دنیا میں بائبل (انجیل) کی طرح اہم خیال کی جاتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہم نے اس ماہرِ تعلیم کے فلسفہ کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید مفکّرین کا موازنہ بھی کیا ہے اور جدید تعلیمی رجحانات کو بھی پیش کیا ہے۔ مضمون کی پیچیدگی اور عمق کی وجہ سے ممکن ہے بعض بعض جگہ خامیاں رہ گئی ہوں

لیکن ہم نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ مضمون نہایت ہی صاف اور سلیس ہو تاکہ ہر شخص کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت اور الجھاؤ نہ پیدا ہو۔

اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں میرے محترم دوست مولانا سعید انصاری صاحب ایڈیٹر رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد نے میری کافی رہبری کی ہے اور زبان میں اصلاح و درستی کی زحمت گوارا کی اور اپنے قیمتی وقت اور علمی مشوروں سے جو مدد پہنچائی ہے اسکا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال مکرم مولانا حافظ جلال الدین احمد جعفری صاحب الہ آبادی نے جس شفقت اور محبت سے میری کتاب کی طباعت و اشاعت میں توجہ مبذول فرمائی ہے اسکا شکریہ قلم اور زبان ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی خاص شفقت اور مہربانی سے یہ کتاب عالم وجود میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ میں مولوی قمر الہدیٰ صاحب کا بھی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے ہمارے کل مسودے کو خوشخط لکھ کر اس کام میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اور ہمارے دو شاگردوں سید رفیع الدین احمد اور سید فخر الدین احمد نے بھی ایک حد تک میرے بوجھ کو ہلکا کیا ہے۔ خدا ان دونوں کو علم کی دولت سے مالا مال کرے۔

تعلیم یافتہ طبقہ سے یہ امید ہے کہ وہ اپنے قیمتی مشورے سے مجھکو مستفید کریں گے اور جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں گی اس سے مجھے آگاہ کریں گے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ترمیم و اصلاح کر دی جائے۔

خادمِ علم
ضیاء الدین احمد الہ آبادی

۲۹۰ شاہگنج الہ آباد
۱۶ / اکتوبر ۱۹۴۱ع

مقدمہ

جدید تعلیمی نظریہ

تعلیم کی تعریف

تعلیم کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں لیکن اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کے بالغ ممبروں کی سعی اور جدوجہد ہے جس سے آنے والی نسلوں کی نشوونما اور تشکیل، زندگی کے نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔ یہ سچ ہے کہ اکثر تعلیم کا لفظ اس سے بھی وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جان اسٹوارٹ مل نے (John Stuart Mill) تعلیم کے دائرہ میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا ہے "جو نوع انسانی کی تعمیر میں ممدومعاون ہوتی ہیں"، اور شاعرانہ حیثیت سے ہم تمام بنی نوع انسان کی تعلیم بھی مراد لیتے ہیں لیکن یہ تمام استعمالات خطیبانہ ہیں جو عامیانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں ذاتی ہدایت اور تربیت ایک ضروری عنصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیمی اسکیمیں بھی تمام تر پڑھے لکھے لوگوں کے تجربات سے بنائی جاتی ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام تجربات (بچے کے لئے)

سبق آموز ہوتے ہیں۔ آیا ایک تجربہ ایک فرد (یعنی بچہ) کی تعلیم کا جزو ہے یا نہیں؟ اس کا جواب اس وقت دیا جا سکتا ہے جب ہم یہ معلوم کر لیں کہ تعلیم کا طریقہ ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کی آغوش تربیت میں بچہ پلا تھا اور وہ اسی کا تجربہ تھا اگر وہ بچہ کا تجربہ تھا تو تعلیم کا جزو ہوگا ورنہ نہیں (۳) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم خواہ اچھی ہو یا بری، اس کی اچھائی یا برائی کا انحصار معلم کی حسن سیرت، دانائی اور ذکاوت پر ہوگا۔ وہ اچھی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب اس سے صحیح نتیجہ نکلے اور اس کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں وہ اسقدر موزوں و مناسب ہوں کہ ان سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکے۔ نیز وہ عقلمندی، یک رنگی اور ثابت قدمی سے کام میں لائے جا سکیں۔

یوں تعلیم معین طور پر ایک انفرادی فعل ہے اور ہر سوسائٹی میں اس کی وسیع تاثیر اور وقعت کے درمیان اختلاف ہوگا۔ کیونکہ تمام زمانوں اور تمام مقامات میں ان لوگوں کی فضیلت، دانائی اور صلاحیت کے متعلق اختلافات ہیں جن کے ہاتھوں میں بچوں کی ذمہ داری اور نشو و نما ہے۔ تاہم باوجود ان اختلافات کے ہر معلم اپنے عہد اور ملک کے رائج تصور اور نظریہ کو کم و بیش مکمل اور واضح طور پہ ظاہر کرتا ہے اس بنا پر کامیاب تعلیمی جد و جہد کے لئے پہلا

بنیادی اصول یہ ہے کہ قوم کو بہ حیثیت مجموعی تعلیم کی فطرت اور قیمت کا بخوبی اندازہ کرنا چاہیئے۔

بہرکیف اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک بیدار اور حساس قوم میں معلمین کا (جو قوم کی حاجتوں کو پورا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں) یہ طے کرنا بہت ہی عام اصطلاحات کے سوا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کس طرح دیں کیونکہ جب ہم ان افراد پر نظر ڈالتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو افلاطون سے متفق ہونا چاہیئے کہ "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے جسم و روح میں ان تمام خوبیوں اور کمالات کی نشو و نما ہو جن کی صلاحیت ان میں موجود ہے"۔ اس سے ان خوبیوں اور کمالات کی فطرت سامنے نہیں آتی اور ان نقطہ ہائے نظر پر کبھی عالمگیر اتفاق نہ ہو سکا بلکہ ہر عہد میں اندازے کے بین اختلاف رہے ہیں۔ انفرادی حسن و کمال کا مظہر، حقیقی زندگی ہے اور ایسی زندگی زمان و مکان، تہذیب و تمدن، قومی جذبات اور مادی حالات پر دسترس کے معین حالات میں بسر کرنی پڑتی ہے اس لئے افلاطونی عہد کے ایتھنز (Athens) کا کمال زندگی، موجودہ لندن (London)، پیرس (Paris) اور نیویارک (New york) سے بہت مختلف تھا۔ لہذا جہاں تک

کوئی تصورِ تعلیم، عملی طریقے کی رہبری کرسکتا ہے وہ یہ کہ اس معاشرہ کی حالتِ ترقی اور تعلیم میں ہر لحاظ سے تعلق ہو جس میں وہ دیجاتی ہے

تعلیم اور قوم

ایک لحاظ سے قوم کے آئین اور عام نظریہ کا اس کی تعلیمی سیرت پر خاص اثر ہوتا ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کی زندگی کے تحفظ و تکمیل میں سرگرم رہے لیکن وہ زندگی انفرادی ممبروں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ ایک مثالی قوم میں انفرادی اور اجتماعی اغراض و مقاصد کی مماثلت ہونی چاہیئے۔ لیکن تاریخ مثالی اقوام کے وجود پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی اور اس کے حالات سے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل سادہ ہیں۔ عملاً اختلافات کا دور دورہ ہمیشہ رہا ہے۔ جس کا نتیجہ کہیں جلبِ منفعت اور کہیں انسدادِ ترقی ہوا ہے۔ مختلف زمان و مکان میں معاشروں کا باہم اختلاف رہا ہے۔ ہر ایک کی دلچسپیوں اور انفرادی ترقی کے دعووں میں مصالحت یا موخر کو مقدم کا تابع بنانے میں سوسائٹیوں کی رغبت بڑی حد تک کامیاب ہوتی ہے اور اُن کی تعلیمی تصورات میں اختلافات کی جھلک فطرتاً نمایاں ہوتی ہے۔ اقوام کا ابتدائی رجحان افراد کی شخصیت کو مکمل طور سے تابع بنانا ہے۔ لیکن مغربی قبائل میں عیسائیت کی آمد کے وقت سے انفرادی

زندگی کی اہمیت بڑھ جانے کے سبب اس رجحان کو روکا گیا اور لطیف بنا کر منعطف کیا گیا۔ وہمی طور پر متناقض لیکن واضح واقعہ ہے کہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء نے اپنی بہت وسیع صف کے حیرت انگیز کھلم کھلا مظاہرے سے گہرے قرب سے اور جدید اجتماعی تنظیم کے وسیع الجھاؤ سے واقعتاً قدیم رجحان کے خلاف ردعمل پیدا کیا۔ اور تعلیمی خیالات میں اس کو ظاہر کیا۔ تعلیمی نظریہ کو ہمیشہ کم و بیش مرکزیت طفل پر مبنی ہونا چاہیئے یعنی ایک ہی بچہ پر ساری توجہ منعطف کرنی چاہیئے اور ان فطری صلاحیتوں اور خلقی قوتوں کو جو اس کو تعلیم یافتہ بناتی ہیں مرکز توجہ بنانا چاہیئے۔ لیکن موجودہ میلان اس سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اس کی رو سے فرد کی تکمیل تعلیمی جد و جہد کی علت غائی ہے۔ اس میں اجتماعی مطالبات سے بے پروائی شامل نہیں ہے اور نہ اس سے معاشرتی انتشار ہی مراد ہے بلکہ نقطہ نظر یہ ہے کہ قومی زندگی کی بہترین تشکیل ایسی تعلیم سے ہوگی جس میں معاشرتی سرگرمیوں کو انفرادی زندگی کے اعلیٰ درجوں تک ترقی کرنے کا ایک ضروری واسطہ خیال کیا جائے۔ یہ اس چیز سے بہتر ہے جس کے ماتحت انفرادی نشوونما کے مطالبات کو قرار دیا جائے۔ یہ تصور کم و بیش صاف طور پر محسوس ہو کر امریکہ، برطانیہ اور دیگر متمدن

ممالک میں نشو ونما کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دیتا رہا اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے اس کی روشنی میں متمدن قوموں نے عملی ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔

نظریہ کے تغیر کی حیرت انگیز علامت ترقی کرنے والے ملکوں میں جمہوری تعلیم کی ازسرِ نو تشکیل تک منتج ہوتی ہے۔ اس کی امتیازی صفت قدیم تصور کو مٹا کر جدید کو لانا ہے جس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس، اہم معاشرتی طبقات سے مطابقت رکھیں۔

اس خیال سے ہر طبقے کے بچے ایسی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع پائیں جس میں طفلانہ ضروریات بہم پہونچانے کا سامان موجود ہو۔ نیز اس میں ثانوی تعلیم عنفوانِ شباب کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔

ممالک متحدہ امریکہ میں ابتدائی تعلیم کی عمارت اسی ستون پر قائم ہے۔ اس لئے وہاں جونیر، اور سینیر ہائی اسکول موجود ہیں جو چھے[۵] تین، تین - اصول پر قائم ہیں۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء میں تعلیمی بورڈ کی کمیٹی نے عنفوانِ شباب کی تعلیمی رپورٹ اسی اصول پر شائع کی ہے۔

---

۵ امریکہ میں قدیم آٹھ سالہ نصابِ تعلیم ختم کر دیا گیا ہے اور اب اس کے بجائے چھ سال کا ایک جدید نصاب تیار کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے تین سال تک جونیر ہائی اسکول کورس کی تعلیم ہوتی ہے جس میں بچوں کے حیاتیاتی، نفسیاتی، اور سماجی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے اور تین سال کا سینیر ہائی اسکول کورس عنفوانِ شباب کے لئے مرتب کیا گیا ہے جس میں ان کی نفسیاتی ضروریات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

جرمن ریخ (Reich) بھی ان تعلیمی تجربات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک حد تک یہ ترقیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ جدید صنعت و حرفت اور آئین حکومت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اوسط درجہ کے شہری کا قدیم شہریوں سے زیادہ بلند معیارِ علم و تربیت ہونا چاہیئے لیکن اس کی اصولی تشریح اس تصور میں موجود ہے کہ ایک قوم کا فرض ہے کہ وہ ذاتی ترقی اور خود فہمی کے بہترین مواقع تمام افراد کی دسترس میں دیدے جو ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

نصاب ان اعتبارات سے نصاب تک خیال کا پہنچنا فطری بات ہے۔ بچوں اور بچیوں کو کیا پڑھنا چاہیئے؟ اس کا صحیح جواب اس اصول میں ہے جو مقصدِ تعلیم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسکول کا یہ کام ہے کہ وہ ترقی و تکملہ اور خاندانی زندگی کے اثرات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بچوں پر ان روحانی قوتوں کا اثر ڈالے جو اس قوم یا جماعت کی خصوصیات میں سے ہو اور اس کو اس لئے تیار کرے کہ وہ قوم کی زندگی کی محافظت اور ترقی میں حصہ لے سکیں۔

اس کام کے انجام دینے میں اسکول کے لئے ضروری ہے کہ وہ

(۱) حقیقی معاشرہ ہو جس میں قومی سیرت کے بہترین نصب العین

موجود ہوں اور اس لئے اس قابل ہو کہ بچوں کے رگ و ریشہ میں وہی خصلتیں اور سیرتیں منتقل ہو کر مستحکم ہو جائیں۔ انگلستان کے نام نہاد پبلک اسکولوں کی شہرت کا دار و مدار انھیں اصول کو کامیابی کے ساتھ چلانے پر ہے ۔ یہ بات مشہور ہے کہ ان اسکولوں کے معاشرتی نصب العین میں جسمانی قوت اور جرأت، نیک اخلاق، قومی روح، ضبط نفس اور آزادی و حکومت خود اختیاری کے لئے تربیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے کیسی شہری کی تخلیق کے لئے یہ تمام باتیں قیمتی عناصر ہیں اور اس لئے ان کا وجود ہر قسم کے اسکولوں کی زندگی میں لازمی ہے ۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اسکولوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلباء کو متعدد مضامین کی تعلیم دیں ۔ یہاں پر ہم جس اصول کی پیروی کرتے ہیں اس کے گوناگوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص قوم کی زندگی اور ضروریات کا وسیع یا محدود نقطۂ نظر رکھے۔ محدود نقطۂ نظر کی رو سے قوم کو کسی وقت کسی قسم کے علم و حذاقت کی ضرورت، پیش آتی ہے تاکہ وہ اپنی اقتصادی اور دوسرے قسم کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے اور اسکولوں کا یہ کام ہے کہ وہ ایسے نوجوان طلباء پیدا کریں جو اس علم و حذاقت سے بہرہ ور ہوں ۔

وسیع نقطہ نظر کے لحاظ سے حال کی افادی ضروریات کو اہمیت دیجاتی ہے
اوراس کے بجائے طلبا کو ان عناصر سے روشناس کرایا جاتا ہے جو
لوگوں کی تاریخی زندگی میں نہایت دائمی اور بنیادی طور پر وقیع خیال
کئے جاتے ہیں۔ ان نظریوں کے تباین سے تشنعنی اور لبرل (عام تعلیم
جو تہذیب نفس کے لئے دیجائے) تعلیم جدید اور کلاسکل تعلیم میں
اور کم واضح طور پر اس تعلیم میں جو علم کی قیمت پر زور دیتی ہے اور
اس میں جو ذہنی تربیت اور تادیب پر زور دیتی ہے تناقض پیدا ہوگیا ہے۔
ان متصادم خیالات میں جو مذکورۂ بالا تناقضات میں شامل
ہیں ہمکو ایک معقول نصاب تعلیم کا تعین لازمی ہے۔ ایسے نظریہ کی
بنیاد یقیناً اس پر قائم ہونا چاہئے جس کو وسیع نقطۂ نظر کہا گیا ہے۔
بالفاظ دیگر اس کے خاص اصول یہ ہوں گے کہ اسکولی معاشرہ اپنے
تخلیقی اثرات میں ان ذہنی، جمالیاتی اور عملی سرگرمیوں کی کیفیتوں کو
شامل کرے جنھوں نے انسانی روح کے ارتقا میں اہم حصہ لیا ہے
اور جن کی وجہ سے عصر جدید کے دماغ کی تشکیل ہوئی، ادب اور
آرٹ، موسیقی و صنعت، ریاضی اور سائنس، جغرافیہ اور تاریخ مکمل
نصاب کے ضروری جوہر ہیں۔ لیکن یہ چیزیں صرف گوناگوں ضرورتوں
کے لحاظ سے مناسب ہوں مثلاً کسی مخصوص صنعت کے لئے تیار

کرتا کسی خاص اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اسکا مقصد صرف اوزار کے استعمال کی حذاقت یا تجربی صنعتی علم نہ ہو بلکہ متعلم کو اسکول میں کسی ایسے ضروری پیشہ یا فن کے اخلاقی، سائنٹیفک یا جمالیاتی روایات کے اندر رکھا جائے جس نے ہمارے تمدن و تہذیب کی ترقی میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور برابر لے رہا ہے۔ اس طرح عمل کرنے سے صنعتی تربیت آبادی کے بڑے حصول کے لئے حقیقی لبرل تعلیم کی تکمیل اور ہمواری کا موزوں طریقہ ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ تربیت جو زیادہ تر قدیم کلاسکس (ادب القدماء) کے مطالعہ پر مبنی ہو لبرل کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ ایسی نہ ہو کہ اس سے ایک طالب علم موجودہ دنیا میں آزاد انسان نہ بن سکے۔ اس کے خیالات حساس ہوں اور وہ اس تربیت کی ذہنی اور معاشری تحریکات کی اہمیت سے با خبر ہو۔

اس نقطۂ نظر سے ذہنی تربیت یا تادیب کا ترقی دینا اور سنوارنا تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے تعلیمی نظریہ اور عمل پر وہ اتنا گہرا اثر برابر ڈال رہا ہے کہ اس کی پُر احتیاط تحلیل کی ضرورت ہے۔ اسی خیال کو لطیفے کے طور پر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک انسان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو وہ اسکول میں سیکھنے اور پھر

بھلا دینے کے بعد یاد رکھتا ہے لیکن ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کیا یاد رکھتا ہے؟ عام نقطۂ نظر کے مطابق اسکولی مطالعوں سے بعض قابلیتیں اور دماغی قوتیں ترقی پاتی ہیں اور وہی ترقی ان کو جاری رکھنے کا اصلی باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً نظمیں جو بچہ روزانہ سیکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسکول چھوڑتے ہی وہ بہت جلد نسیاً منسیاً ہو جائیں لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے اسکا حافظہ قوی ہو جاتا ہے اور یہی اس کی کافی تائید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو کبھی بھی اپنے حاصل کردہ علم طبیعات اور علمِ کیمیا کے استعمال کرنے کا موقعہ نہ ملے لیکن مضائقہ نہیں اگر اس نے ان علوم سے قوت مشاہدہ اور قوت استدلال حاصل کر لی ہوں جن کی قیمت عالمگیر ہے اور اس نے تمام بحث طلب امور میں سائنٹیفک طریقہ کے استعمال کی عادت ڈال لی ہو۔ اسی طرح یہ خیال بھی رائج ہے کہ علم ہندسہ سے قوت تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور جبر و مقابلہ سے دماغی درستی۔ ان مثالوں میں نفسیاتی قوت ذہنی یا نظریہ نقل تربیت ذہنی کا مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی فطری قوت کو ایک موضوع پر تربیت دینے میں دوسرے موضوع کی تربیت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جدید نفسیاتی تجربات نے اس خیالِ پارینہ کی عمارت کو متزلزل کر دیا ہے۔ ان سے یہ ثابت

ہے کہ ایک انسان جو اشعار کے یاد کرنے میں طویل مشق سے اپنی قوت حافظہ کی تربیت کرتا ہے وہ کسی حالت میں نثر کے ٹکڑوں کو اس سے کم محنت میں یاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قابل یقین نہیں کہ علمِ نباتات اور علمِ طبقات الارض کا ایک ذکی ناظر جس سے [illegible] کی سرعت اور اعتماد کے اوصاف حاصل کر لئے ہیں وہ ان کو دہلی کی شاہراہوں پر موٹر چلانے میں مدد دیں گے۔ ان یقینی واقعات اور عمومی اعتبارات سے دماغی تربیت کا خیال باطل ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ وہ ظنیات جو جان لاک اور دیگر قابل اور تجربہ کار معلموں کی کاوش کا نتیجہ ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "تعلیم" میں صحیح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکولی مطالعوں کی قدر علم اور قدر تربیت کا تناقض بالکل غلط ہے۔ اگر ہم اپنے طلبار کو ایسے علم سے روشناس کریں جو بیش قیمت ہے یعنی وہ علم جس کی امور زندگی کے منضبط کرنے میں ناگزیر عملی قیمت ہے تو ہم ان کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین ممکن دماغی تربیت کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ ناقابل یقین ہے کہ بہترین قسم کے علم کی تلاش سے بہترین دماغی تادیب نہیں ہو سکتی۔ اس دلچسپ عقیدہ کو جہاں تک اسپنسر کا ذاتی تعلق ہے

مسئلہ ارتقا کے ماننے والے کے عقیدے کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اس کو مذکورۂ بالا عام اصولِ نصاب کا نتیجہ بھی خیال کرنا چاہیئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ بہترین تعلیمی سرگرمیاں وہ ہیں جنھوں نے تمدن کی ترکیب اور ترقی میں ضروری اور مستقل مدد پہنچائی ہے۔ ان امدادوں کا حقیقی سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو قوم کے نابغے (Genius) تھے مثلاً بڑے بڑے آرٹسٹ، صنّاع، شعرا، ادبا، مُغنّی اور سائنٹسٹ، ارباب سیاست، یہی لوگ ایوان تمدّن کے نقّاش اور معمار ہیں اور انھیں لوگوں نے سرگرمیوں کی تشکیل اور شائستگی کی ہے۔ ان کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی اور اس طرح سرگرمیوں کی روایات ذہنی، جمالیاتی اور عملی کی تخلیق ہے، جن کی معین اور مخصوص شکلیں آج ہمارے سامنے ہیں۔ اسی طرح شعری اور نفیس ادبی روایات کی نشو ونما عالمگیر عادت نطقی کے ارتباط سے ہوئی ہے۔ فن تعمیر اور صنعت مادی زندگی کی عالمگیر ضروریات سے بڑھے ہیں۔ سائنس کی ترقی عالمگیر عطیۂ تجسس اور بے پایاں عملی مقاصد کے لئے قطعی علم کی ہمہ گیر ضرورت سے ہوئی، اور اسی طرح دوسری بنیادی سرگرمیوں کی جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں نشو ونما ہوئی۔ جس قدر ایک طالب علم کا مطالعہ ان روایات سے اسکا قریبی تعلق

پیدا کر دیتا ہے یا اس میں ان کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اسی قدر اسکا دماغ ان اعلیٰ دماغوں کا پرتو اور آئینہ ہو جاتا ہے جنھوں نے ان کو وضع کیا تھا اور یہی دو طریقے ہیں جن سے اس کا دماغ منظم بھی ہو جاتا ہے الغرض اسکولی زندگی کے نظم اور مطالعہ سے یہ مراد ہے کہ بچوں میں یہ قوت و صلاحیت چھوٹے پیمانے پر پیدا ہو کہ وہ جلیل القدر شعراء کے ہم جلیس، ماہرین فن کے ہمسر، حکما اور فلاسفہ کے ہم رتبہ ہو سکیں۔ ان میں وہ دقت نظر پیدا ہو کہ فطرت اور کائنات کا مطالعہ ایک سائنسداں کی عینک سے کریں اور ایسے شہری ہوں کہ ان کے پیش نظر عظیم الشان شہریوں کی مدنی زندگی کا نصب العین ہو۔ اس قسم کی تادیب و تربیت مستحکم ہوتی ہے تا کہ پائدار ہو، اور اس کی قیمت ہمہ گیر ہے کیونکہ جو سرگرمیاں اس کی تشکیل کرتی ہیں وہ متمدن زندگی کی بنیادی سرگرمیاں ہیں۔

ابھی تک مدرسہ کے نظام میں مذہبی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ اس مختصر مضمون میں شرح و بسط سے لکھنا ممکن نہیں۔ کچھ تو یوں کہ مذہب کی اصلاح بہت ہی پیچیدہ اور بے پایاں مذاہب پر مشتمل ہے اور کچھ یوں کہ لوگوں کا اندازہ مذہب کے متعلق اسقدر گوناگوں ہے کہ بعض حالتوں میں بالکل متضاد ہو جاتا ہے۔

علاوہ بریں بہت سے لوگ متناقض معتقدات کے پیرو ہیں جو اخلاقیات کی تعلیم بغیر مذاہب کے جائز اور لازم خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک مذہب ایک روحانی مرض ہے یا یوں سمجھئے کہ تہذیب کے عہد طفولیت کا فریب محض ہے جس کو موجودہ زندگی میں ناپید ہو جانا چاہیئے۔ جو لوگ انتہائی نقطۂ نظر کے علمبردار ہیں وہ نصاب سے مذہبی تعلیم کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں وہ قوموں کی زندگی میں کسی اہم اور مستحکم قیمت والے عامل کی نمائندگی نہیں کرتی۔ باوجود اس کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتہا پسند بھی ایمان رکھتے ہیں جن کے پیش نظر متعین نصب العین کی اعلیٰ قیمت ہوتی ہے۔ یہ معترف ہیں کہ وہ نصب العین بجا طور پر خدمت کا مطالبہ کرتے ہیں اور اصلاح باطن پر کچھ اثر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ایمان یقیناً مذہبی کہلائے گا کیونکہ وہ تمام صحیح اور سچے مذاہب کا لب لباب ہے تو یہ شبہ کہ آیا نصاب تعلیم کا عام اصول مذہبی تعلیم پر منطبق ہوتا ہے۔ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ اسکا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مذہب اس وسیع مفہوم میں انسانی جماعتوں کی بقا اور ترقی کا ایک بنیادی عامل ہے اور اس لئے . . . .

اس مذہبی تعلیم کو لازماً اسکولی معاشرہ کا ایک عامل ہونا چاہئے۔

لیکن یہاں پر مذہبی تعلیم (بہت عام مفہوم ہیں) اور مخصوص معتقدات کے مابین رشتہ کا سوال باقی رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر کوئی اصولی اتفاق بآسانی نہیں ہو سکتا۔ غالباً دماغی ترقی کے عام خط وخال کے متعلق سب لوگ متفق ہوں گے یعنی مذہب کے اعتقادی عناصر (جن کی فطرت اس منظّم نظریہ کی فطرت کے مماثل ہے جو مذہبی عبادت کے مقاصد اور سرچشموں سے متعلق ہے) ان پر عنفوانِ شباب سے پہلے کم زور دینا چاہئے لیکن اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے تو اس کی تطبیق، مباحثے کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

اسکولی حکومت

اسکولی نظمِ حکومت کے متعلق اسی قسم کی کچھ نظری مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسکولی معاشرہ کا دار و مدار اس مصنوعی مجبوری پر ہے جس کی نوعیت اس بڑی سوسائٹی کے دبانے والے اثرات سے مختلف ہوتی ہے جن سے ایک شہری ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکولی حکومت کا حاصل بزرگوں کے منتخب مقاصد کی روشنی میں بچوں کی زندگی کا انضباط ہے۔ تاہم چونکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ بچے اور بچیاں بہ حیثیت مرد اور عورت کے بڑی سوسائٹی کی عمومی زندگی میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنا سیکھیں

اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے بنیادی خط و خال اسکولی معاشرہ میں موجود ہوں - جہاں جہاں جمہوری عقائد کا دور دورہ ہے وہاں اس اصول کو کام میں لانا غیر یقینی سا ہے - موجودہ دور میں انگلستان، امریکہ، جرمنی اور دیگر ممالک میں اسکولی نظام حکومت کو مکمل جمہوری بنیاد پر چلانے کے تجربات کئے گئے ہیں جن کی رو سے بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ اپنی چھوٹی سی ریاست میں بحیثیت قانون ساز اور حاکم عدل کے فرائض انجام دیتے ہیں - چونکہ اس قسم کے تجربات بچوں کی نشوونما کی روایات سے متناقض ہیں اس لئے ان کی عملی کامیابی میں بہت مشکلات ہوتی ہیں - ایسے ماحول میں یہ تجربات کامیابی حاصل کرتے ہیں جہاں قصوروار طلبا کو بداخلاقی سے زیادہ ارباب بست وکشادگی بدنظمی اور بدعملی سے نجات دلانے کا سوال پیدا ہوتا ہے، بعض ممالک میں اسکولی حکومت کی باگ ڈور اسکولی معاشرہ کے بالغ ممبروں کے سپرد کر دیجاتی ہے - انگلستان میں خاصکر موجودہ اسکولوں اور گزشتہ صدی کے اسکولوں کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک نمایاں عام ترقی اسی جانب میں ہوئی ہے جس کو زیادہ دلیر مصلحین بہت آگے بڑھا سکے ہیں - اساتذہ کا استبدادی رویّہ جو ایک زمانہ

ہیں ان کا طرۂ امتیاز تھا محسوس طور پر معتدل ہوتا جاتا ہے۔ اب وہ حاکمِ مطلق کی طرح اپنی مرضی کا اثر ڈال کر کام نہیں کرتے بلکہ ان کی حیثیت ایک ہادی یا فطری مربی کی ہے۔ جس کے قائم رکھنے میں ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ اب اسکولوں میں یہ خیال عام طور پر پھیل رہا ہے کہ اسکول کی حکومت کا بوجھ ان بالغ طلبا کے کاندھوں پر رکھا جائے جو اسکولی افادے کو سمجھ سکتے اور اس کی ذمہ داریوں کو برداشت کر سکتے ہیں کیونکہ اس طریقے سے طلبا کی مرضی کے مطابق کام ہوگا۔ خود اختیاری اور ذمہ داری کا احساس ہوگا اور نیز اس سے اخلاق کی نشو و نما بھی ہو سکے گی۔

سزا سزا کا قدیم نظریہ بھی اسکولی حکومت کے نظریہ کی طرح بدلنا ہوگا کیونکہ سزا حکومت کا ایک آلہ ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کسی زمانے میں سزا اسکولی حکومت کا ایک اہم آلہ تھا لیکن آجکل کوئی معلم اسکا استعمال اس تشدد سے نہیں کرتا جیسا کہ پہلے معقولیت اور درستی کے خیال سے کرتا تھا۔ اس کی وجہ موجودہ مذہب انسانیت نہیں ہے کیونکہ موجودہ تعلیمی نظریہ کی روشنی میں استاد بے چینی اور پریشانی سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتا ہے کہ سزا کی ضرورت اس بات کی علامت

ہے کہ طلبار کی حقیقی ضروریات اور اسکولی زندگی کے حالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی - اس ہم آہنگی نہ پائے جانے کا ذمہ دار خود اُستاد ہی ہے - اسی لئے وہ اصلاحِ شر کے لئے سزا کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ ان حالات کی درستی کی سعی کرتا ہے - ایسی پالیسی عام اصول کے مطابق ہے جس کی وجہ سے اسکول کا کام صحت بخش اور قیمتی قسم کی قطعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے - نیز یہ خیال بھی اہم ہے کہ دماغی تادیب کی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب صحیح کام کو صحیح طریقہ سے انجام دیا جائے - اس میں شک نہیں کہ اسکول میں خودسری نمودار ہو جائے گی - چاہے وہ کتنا ہی سائنٹیفک طریقہ سے چلایا جائے کیونکہ معلم کا فرض نہ صرف طلبار کے غلطی کرنے کے انسانی رجحان کا جانچنا ہے بلکہ والدین کے غیر دانشمندانہ سلوک کا معلوم کرنا ہے جو انھوں نے بچوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے ساتھ کیا - غلط کاری اور اس کے متعلق سزا کے انسداد کی حقیقی بھی خواہش کی جائے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی - باوجود اس کے بچوں کے ساتھ حکیمانہ برتاؤ، کورانہ استبدادی ضابطہ سے زیادہ اصلاح کا حامل ہو سکتا ہے -

باب اول

ڈیوی کا نظریۂ تعلیم

سوانح حیات بیسویں صدی کی مایۂ ناز و فخر روزگار ہستیوں میں جان ڈیوی کو خاص امتیاز اور اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک طرف فلسفی، ماہر اخلاقیات، منطقی، ماہر نفسیات اور دوسری طرف معلّم اور فلسفۂ تعلیمات کا امام اور درخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" افلاطون کی "ریاست" کے ہم پلّہ خیال کی جاتی ہے۔ وہ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۵۹ء میں برلنگٹن میں پیدا ہوا۔ اپنی ابتدائی تعلیم نیو انگلینڈ اسکول میں حاصل کی اور اے۔ بی کی ڈگری جامعہ ورمانٹ سے ۱۸۷۹ء میں لی۔ ۱۸۸۴ء میں اس کو ہاپکنس یونیورسٹی واقع بالٹی مور سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۶ء تک جامعہ میچیگان میں فلسفہ کا درس دیتا رہا۔ ۱۸۸۸ء میں وہ جامعہ مینیسوٹا میں پروفیسر مقرر ہوا۔ اور ۱۸۸۹ء میں دوبارہ شعبۂ فلسفہ کے صدر کی حیثیت سے جامعہ میچیگان گیا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۴ء تک وہ

جامعہ شکاگو میں شعبۂ فلسفہ کے صدر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اسی جگہ سے اس کی شہرت تعلیمی حلقوں میں بڑھنی و پھیلنی شروع ہوئی۔ عرصہ تک وہ کولمبیا یونیورسٹی میں ۱۹۱۴ء سے فلسفہ کا پروفیسر رہا۔ اب ریٹائر ہو کر نیویارک میں مقیم ہے۔ ۱۹۰۴ء میں جامعہ وسنگاکنسن اور ۱۹۱۰ء میں جامعہ ورمانٹ نے اس کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی، وہ مختلف بڑی بڑی بین الاقوامی انجمنوں کا رکن و صدر ہے اور اس کے مضامین وقت کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نظریۂ عملیت (Theory of Pragmatism) | جان ڈیوی

چارلس پیرز اور ولیم جیمس کے نظریۂ عملیت سے کافی متاثر ہو چکا ہے۔ اس نے منصبیت اور آلیت کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے کسی شے کا معیار حقیقت صرف یہ ہے کہ اسکا تعلق انسانی اغراض و مفاد سے ہو اور جو نظام عالم میں جاری ہو سکے وہ صحیح ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ابتدائی اسباب کے مطالعہ سے قطع نظر کر کے اس کے عملی پہلو اور نتیجہ کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ وہ حقیقت کی جستجو میں معقولات، زبانی حلوں، اٹل اصولوں، کلیات ازلی اور ابتدائی

اشیاء کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ صرف واقعات، تجربات و مشاہدات کو مشعلِ ہدایت بناتا ہے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ یہ فلسفیانہ طریقہ ڈارون کے خیالات و تحریرات کا رہینِ منت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ڈارون کی کتاب "نوع انسانی کی ابتدا" کے شائع ہونے سے قبل غیر نامیاتی ہیئت، طبعیات و کیمیا میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ اور دنیائے قدیم کی غیر متبدل و پائیدار اشیا کے بجائے بے ثبات و متغیر عالم میں نئی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈارون نے حیاتیاتی سائنس میں انقلاب پیدا کیا لیکن اسکا اثر علوم سیاسیات، اخلاقیات، منطق، و مذہب پر بھی پڑا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج شعبۂ حیات کے ہر پہلو پر غور و فکر کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں طبعیاتی و ریاضیاتی عالم کا تصور اسی وجہ سے حیاتیاتی و حرکی سمجھا جاتا ہے۔

ڈیوی کا میلان و رجحان انسانی زندگی اور جد و جہد کی طرف ہے جو تحقیق و تفتیش اور تجربہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی مثال وہ عالم اخلاقیات میں یوں دیتا ہے کہ اصول اٹل اور ابدی نہیں ہونے چاہئیں بلکہ مفروضہ دعوے ہونے چاہئیں تاکہ وہ برابر آزمائے جا سکیں، اور ان میں وقتاً فوقتاً امتداد زمانہ کے مطابق

تغیر و تبدل کیا جا سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خیالات کے ساتھ ساتھ راہ و روش اور طور و طریقہ کو سمجھے تاکہ وہ زمانہ کی رفتار پر قابو پا سکے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ قابو حاصل کرنا افراد کی روشن خیالی اور فطانت پر منحصر ہے اور یہ بات جمہوریت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جو باوجود اپنی تمام کمزوریوں اور خرابیوں کے فرد کی مکمل نشو و نما اور ارتقار کا بہترین ذریعہ ہے۔ نظریۂ عملیت کے تحت وہ علم کو اخلاق سے جدا نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے فلسفہ کا صحیح نظریہ تعلیمی نظریہ میں پنہاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فلسفہ و تعلیم کے تعلق کو زندگی کی نشو و نما اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس کے نظریۂ جمہوریت سے بحث کرنا ناگزیر ہے۔

تخلیقی جمہوریت | جمہوریت کا سب سے پہلا علمبردار افلاطون تھا جس نے نظامِ حکومت کا ایک ذہنی خاکہ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ریاست" میں پیش کیا۔ وہ حکومت کو افراد کی بہبود و فلاح کا ضامن ٹھہراتا ہے۔ اور تعلیم کو حکومت کے اہم ترین فرائض میں شمار کرتا ہے۔ اور ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افلاطون کی "ریاست"

کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"افلاطون سے پہلے بھی عام طور سے یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا۔ یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاعِ روحانی و اخلاقی کی مالک ہو۔ اس لیئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنادے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاعِ روحانی کے ذریعہ دوسرے افراد سے رشتۂ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انھیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے" صفحہ ۱۸

افلاطون کی سرکردگی و قیادت میں یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر و مفکرین نے قدم اٹھایا جس میں رُوشو، پسٹالوزی، فروبل اور ڈیوی وغیرہ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ڈیوی بیسویں صدی میں جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اور اس کے نشہ سے سرشار ہے کہ

افراد کو وہ کسی حالت میں جماعت سے جدا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے جدید مضمون "تخلیقی جمہوریت" (Creative Democracy) میں جو جریدہ "یونیٹی" (Unity) میں شائع ہوا ہے لکھتا ہے :۔

جمہوریت ذاتی زندگی کا طریق عمل ہے جو نہ صرف تمام انسانی فطرت کے عقیدہ کا تابع ہے بلکہ اسکا انحصار اس یقین پر ہے کہ اگر صحیح حالات و ماحول فراہم کر دیئے جائیں تو انسانی قوت مناسب امتیاز اور عمل کر سکے گی مجھ پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ مجھ کو فطانت اور ارتباط تعلیم و فطانت میں وہمی یقین ہے لیکن اس عقیدہ و ایمان کے ایجاد کا سہرا میرے سر نہیں ہے۔ میں نے تو اس کو اس ماحول و گرد و پیش سے حاصل کیا ہے جس میں جمہوریت ایک پیکر مجسّم اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔ عقیدۂ جمہوریت کیا ہے؟ اور کس شئے کا نام ہے؟ وہ ذہانت کی اس قوت میں مضمر ہے جس سے ایک معمولی انسان اپنی معمولی عقل اور غور و فکر سے واقعات و خیالات مروجہ کا جواب دینے پر اعتماد کامل رکھتا ہو۔ اور یہ آزاد تحقیق و تفتیش، آزاد آئینِ مجلس، اور آزاد آمد و رفت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

آج جب ہم بیرونی ممالک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں جہاں عورتیں اور مرد دل کو مخبر اور جاسوس کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا ہے اور جہاں دوستوں سے گفت و شنید بھی باعث خطر ہے اور جہاں اجتماعی حیثیت سے اکٹھا

ہونا بھی جز ہم و تفہیم ہے تو ہم کو اس عقیدہ میں اور زیادہ استحکام اور پختگی ہو جاتی ہے کہ جمہوریت ہی میں آزاد طور پر امیر و غریب شہری و دیہاتی، جاہل و عالم سب لوگ مکان کے اندر اور باہر گفتگو اور بات چیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جمہوریت اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتی کہ اس میں تعصب، تنزشگوئی، ہتک عزت یا ذاتی بدنامی جس سے مذہبی، سیاسی، معاشی اختلاف برپا ہو، یا جس سے رنگ، نسل، دولت اور تمدن کا افتراق ہو سرا ہا جائے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بغاوت و سرکشی کے مترادف تصور کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شئے جو آزادئ آمد و رفت اور آزادئ گفت و شنید کی ترقی میں مانع ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کو تفرقوں، ٹولیوں، فرقوں اور قبیلوں میں تقسیم کرتی ہے اور متضاد جماعتوں میں تصادم پیدا کرتی ہے۔ زندگی کے جمہوری طور و طریقہ کی عمارت کو متزلزل کرتی ہے۔ شہری و ملکی آزاد خیالی، آزادی رائے، آزادی اجتماع صرف قانونی ضمانت و کفالت سے سود مند نہ ہوگی اگر روزمرہ زندگی یعنی آزادی آمد و رفت، آزادی خط و کتابت، آزادی لین دین، آزادی عمل و تجربات میں باہمی بدگمانی و شبہ، سخت کلامی، خوف اور بغض و عناد سد راہ

ہو جائیں۔ یہ تمام چیزیں جمہوری طرز معاشرت کی اہمیت کو برباد کرتی ہیں اور ان کی بربادی دنیا ہی ظاہری جبر و استبداد سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ اسکا بیّن ثبوت اور عملی مثال موجودہ آمری اور استبدادی حکومتوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب افراد کے دماغ میں عناد و بدگمانی اور تعصب گھر کر جاتی ہے تو وہ بہت پر خطر ہو جاتے ہیں۔

جمہوریت بحیثیت زندگی کی راہ و روش و طریق عمل کے ذاتی عقیدہ کی تابع ہے اور روزمرہ کے اشتراک عمل پر مبنی ہے جمہوریت وہ عقیدہ ہے جہاں ہر فرد کے لئے ضروریات اور نتائج و ثمرات جدا جدا ہوتے ہیں اور برادرانہ تعاون اور اشتراک کی عادت خود ہی زندگی کے لئے ایک گرانمایہ اضافہ کرتے ہیں، جیسا کہ کھیل کود میں لاگ ڈانٹ اور مقابلہ کا درجہ ہوتا ہے۔ ہر اس فساد اور جھگڑے کو جو پیدا ہوتے ہیں اور جن کا پیدا ہونا لازمی ہے مباحثہ کا رنگ دیدیا جائے، جہاں ذہانت کا مظاہرہ ہو اور اخوت و برادری کا جذبہ کارفرما ہو۔ حقیقی جمہوری امن و آشتی کیا ہے؟ کیا وہ ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ پر بالجبر دباؤ ڈالنے کا نام ہے؟ کیا وہ دباؤ یا انسداد کسی نہ کسی صورت میں متشددانہ ہے، چاہے وہ بجائے ظاہری قید و بند کے نفسیاتی طور پہ

یعنی استہزاء، مذاق، سخت کلامی اور دھمکی سے ہو؟ نہیں! امن اس ایمان و یقین پر مبنی ہے کہ جس کی رو سے جھگڑے، فسادات اور اختلافات کا رد عمل میل جول، بھائی چارہ اور اشتراک عمل سے کیا جائے اور جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو خیالات کے ظاہر کرنے اور عمل کو پیش کرنے کا موقع دے سکیں۔ اختلاف رائے کو اس لئے باہمی اور متحدہ طور پر موقع دینا کہ اظہار رائے اور اظہار اختلاف نہ صرف دوسروں کا حق ہے بلکہ شخصی تجربات زندگی کو وسیع کرنے کا ایک کامیاب ذریعہ و وسیلہ بھی ہے۔ یہی روح جمہوری زندگی کے طریق عمل میں کارفرما ہے اور اس کی جبلت و فطرت ہے۔ وہ اخلاقی نصب العین ہے اور اسکا حصول روزمرہ کی زندگی ہے۔

جمہوریت ایک عقیدہ ہے انسانی تجربہ کی لیاقت و صلاحیت کا جو مقاصد و ذرائع کی افزائش کرتا ہے۔ اور جس سے جدید تجربے منظم طور پر ترقی کرتے ہیں۔ ہر اخلاقی و معاشرتی عقیدہ کی تشکیل و تنظیم اس خیال پر مبنی ہے کہ تجربہ کو کسی نہ کسی موقع پر اور کسی نہ کسی صوری و ظاہری چیز کا یا کسی حاکم کا جو احاطۂ تجربہ سے باہر ہو تابع ہونا چاہئے۔ جمہوریت وہ ایمان ہے جس کی رو سے تجربہ کا عمل بہ نسبت کسی نتیجہ کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تاکہ مخصوص نتائج جو حاصل ہوتے ہیں

اعلیٰ اقدار کے ہوں اور ان سے متحرک عمل کی تشکیل و تعمیر ہو۔ چونکہ یہ عمل تعلیمی ہے اس لئے جمہوریت میں عقیدہ رکھنا تجربہ اور تعلیم کے عقائد کے مترادف ہے۔ تمام نتائج و اقدار جو حرکت و ترقی کرنے والے ہیں مستحکم اور پائدار ہو جاتے ہیں اور حاصل شدہ چیز میں استحکام پیدا کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں اور نئے اور بہتر تجربات ان کی رہبری کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس سلسلے میں دریافت کرے کہ تجربہ کیا ہے تو میں یہ جواب دوں گا کہ انسانی افراد اور گرد و پیش کے حالات کے تفاعل کا نام ہے۔ ماحول انسانی ہونا چاہیئے جو ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے اور اطمینان و تسکین بخشے اور جو ہماری معلومات میں اضافہ کرے۔

مروجہ حالات کا علم، آمد و رفت اور اشتراک عمل کی بنا ہے علاوہ ازیں آمد و رفت سے مراد چند لوگوں کا دوسروں کی ذاتی رائے کی غلامی اور پیروی ہے۔ احتیاج، ضرورت اور خواہش ہمت و قوت کی افزائش کرتی ہے۔ یہ دائرۂ ہستی سے ارفع و بلند تر ہے اور اسی وجہ سے علم و سائنس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔

جمہوریت کا اگر زندگی کے دیگر طریق عمل سے مقابلہ کیا جائے تو وہ معیشت و زیست کا واحد طریقہ ہے جو تجربہ کے عمل پر کامل یقین رکھتا ہے اور وہ خود ہی راہ خود ہی منزل، آپ ہی ابتدا اور آپ ہی انتہا

ہے۔ اور جو سائنس کی افزائش و ترقی کے قابل و لائق ہے اور جس کا حقیقی انحصار مزید تجربہ کی رہنمائی کرنے پر ہے اور جو جذبات، حاجات و خواہشات کو آزاد کرتا ہے اور ایسی چیزیں مہیا کرتا ہے جس کا ماضی میں وجود تک نہیں ہوتا کیونکہ زندگی کی ہر راہ جو جمہوریت کے معیار تک نہیں آتی اتصال مبادلہ، آمد و رفت اور تفاعل کو جن سے استقلال، استحکام و پائداری ہوتی ہے محدود کرتی ہے، آزادی و تونگری کا کام ایسا ہے جس کا روزانہ انجام دینا لازمی ہے۔ چونکہ وہ لامتناہی ہے اور اسکا منتہائے مقصود تجربہ کی اکملیت و انتہا ہے۔ اس لئے جمہوریت کا ہمیشہ یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ آزاد اور بہتر انسانی تجربہ کی تخلیق کرے جس میں ہر شخص کو باہم حصہ ملے اور ہر شخص معین و شریک ہو۔

تجربہ کی مسلسل تعمیرِ نو ڈیوی کے تمام فلسفہ کی اساس تجربہ و مشاہدہ ہے۔ وہ تعلیم کو نشو و نما کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں تعلیمی طریق و روش تجربہ کی متواتر تعمیرِ نو کا نام ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تجربہ بہترین معلم ہے۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کہ علم یا ہم زندگی کے گزرنے سے

حاصل ہوتا ہے اور عہد طفولیت سے سن بلوغ تک ترقی کرنے میں عقل و فراست بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہتی ہے۔ یہ اسکول کا فرض عین ہے کہ وہ اس (تجربہ) کی ترقی میں ہاتھ بٹائے بلکہ علم کو اس کے دوش بدوش کافی سرعت کے ساتھ چلنے دے تاکہ زندگی کے صحیح و اصلی تجربات سے روشناس ہو کر شمع راہ کا کام دے، کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر انسان تجربہ سے مختلف سبق حاصل کرتا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کو زندگی میں اول سے آخر تک یکرنگی و جمود معلوم ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے لئے زندگی ہر روز ایک نیا علم و پیغام لاتی ہے اور ان کے خزانۂ دانشمندی میں اضافہ کرتی ہے۔

یہ اختلاف کیوں ہے؟ کیا یہ فطری قوتوں کے باعث ہے یا تعلیم کے اختلاف کا نتیجہ ہے؟ ڈیوی نے اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنی تصنیف "جمہوریت و تعلیم" میں لکھتا ہے "تجربہ کی ماہیت کو یوں سمجھئے کہ وہ حرکت و جمود کے عناصر کا مجموعہ ہے۔ تجربے کا حرکی یا عملی پہلو سعی و کوشش ہے جس کی مکمل تشریح دار التجربہ یا معمل کا عمل، اور تجربہ ہے۔ جمودی پہلو مصائب و آلام کو برداشت کرنے اور جھیلنے کا نام ہے۔ جب ہمیں کسی شئے کا شعور یا تجربہ ہوتا ہے تو وہ اس پر عمل کرنے کا محرک

ہوتا ہے۔ اور ہمارا عمل کسی نہ کسی طرح اس سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر ہم پر اس کے نتائج کا اثر ہوتا ہے۔ ہم اس چیز پر اثر ڈالتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ایک عجیب انوکھا اجتماع و ارتباط ہے۔ تجربہ کے ان دونوں پہلوؤں یا صورتوں کا اتصال و ربط اس کی قدر و مفاد کا معیار ہے۔ صرف عمل و حرکت ہی کا نام تجربہ نہیں ہے۔ وہ تجزیہ کرنے اور انتشار کو ایک مرکز پر لانے کا نام ہے۔ تجربہ بہ معنی جدوجہد تغیر و تبدل کو اپنے ہمراہ لاتا ہے لیکن تغیر ایک بامعنی سی حالت ہوگی اگر اس کے ساتھ ساتھ ان نتائج کا احساس نہ ہو۔ جو اس سے وابستہ و متعلق ہیں۔ جب کوئی عمل نتائج کے معلوم کرنے میں مسلسل جاری رہتا ہے اور جب عمل کے تبدل کا پرتو و انعکاس ہم میں تغیر پیدا کر دیتا ہے تو مسلسل حرکت بہت پر معنی ہو جاتی ہے، اسی وقت ہم کچھ سیکھ سکتے اور حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً جب ایک بچہ اپنی انگلی آگ میں ڈالتا ہے تو وہ تجربہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ تجربہ اس حالت کو کہتے ہیں جب بچہ تکلیف کی شدت سے انگلی کو حرکت دیتا ہے اور اس کے نتیجہ کو بھگتتا ہے۔ آگ میں انگلی ڈالنے کے معنی جلنے کے ہوئے لیکن اگر اس بات کا احساس نہ ہو کہ یہ نتیجہ کسی اور وجہ سے ہوا ہے تو لکڑی کے جلنے کی طرح انگلی کے جلنے سے

صرف اس کی ظاہری شکل وصورت بدل جائے گی ....
تجربہ سے کچھ حاصل کرنے اور سیکھنے کے لئے دور اندیشی سے کام لینا پڑتا ہے اور پیش و پس پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے تاکہ معلوم ہو تا رہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اور آخر میں ہم کو کتنا لطف و سرور حاصل ہوتا ہے یا کتنی تکلیف و پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق تجربہ سعی وجدوجہد، نتائج کے برداشت کرنے اور ان دونوں کے تعلقات کے پہچاننے پر مشتمل ہے۔ اس میں حیات کا تسلسل اور اتحاد شامل ہے۔ مبہم اور منظم عمل ایک غیر مربوط اور کورانہ لائحہ عمل سے مختلف ہے اور جو کام آزمودہ ہو وہ عملی اقدام میں برابر معین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمل افزائش پذیر ہے اور ہر ذمہ دار عمل اور کام کے لئے ہم کو ہمیشہ آزمودہ نتائج کو مدنظر رکھنا لازمی ہے۔

ڈیوی لکھتا ہے کہ "علم کا فرض ہے کہ وہ ایک تجربہ سے دوسرے تجربوں میں پوری طرح فائدہ پہونچائے۔ ایک مکمل علم تعلقات کی ایسی منظم و مسلسل کڑی پیش کرتا ہے کہ پرانے تجربے کی روشنی میں نئے تجربات سے پوری طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے اور مشکل و پیچیدہ حل بآسانی دریافت کیا جا سکتا ہے۔

ڈیوی قدیم چیزوں کی قدامت کو نہیں سراہتا بلکہ وہ ان کی قدر و قیمت اس وقت سمجھتا ہے جب وہ زمانہ حال کی ضروریات کو پورا کرنے میں معین ہوں۔ وہ لکھتا ہے "ماضی کے بعد جو زمانہ آتا ہے وہ حال نہیں اور نہ وہ جو ماضی کا پیدا کردہ ہو بلکہ حال زندگی کی طرح گزشتہ کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا نام ہے۔ موجودہ متحرک و رفتار انگیز دنیا میں گزشتہ و ماضی سے اسی حد تک مدد لی جاسکتی ہے جس حد تک ماضی سے ہماری تحریکات جدید کو ہدایت و رہبری ملے"۔

یہ ایک مقولہ ہے کہ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرنا دانائی نہیں ہے بلکہ دانائی و حکمت یہ ہے کہ ایک ہی غلطی بار بار نہ کیجائے۔ اور تجربہ ہم کو یہی دانائی و حکمت سکھاتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ تجربات کا سیلاب ہمارے اوپر سے گذر جاتا ہے اور ہم کو بالکل احساس نہیں ہوتا۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم زندگی کو صرف سطحی نظر سے دیکھتے اور اس کی بناوٹ اور ظاہری خوبیوں سے محظوظ و متاثر ہوتے ہیں، لیکن ہم اس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بے حس اور اس کے مخفی اسباب و نتائج کے تعلقات سے بے بہرہ و بے خبر رہتے ہیں۔ روزمرہ کی ایک مثال سے یہ بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کو ایسا موقع ضرور ہاتھ آیا ہوگا اور اس نے خوشی کا احساس بھی کیا

ہوگا کہ جب نئے واقعات واہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا تو آزمودہ تجربات نے اس کی پیچیدگی کے حل کرنے میں مدد کی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب ہم کسی الجھاؤ میں پھنس جاتے ہیں اور وہ گتھی سلجھتی نہیں تو افسوس یا غصہ کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور خیال کرتے ہیں کہ کاش وقت پر سوچتے تاکہ یہ دشواریاں آسان ہو جاتیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور مشکلات کیوں سدراہ ہوئیں؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ ہم نے گزشتہ مواقع کو ہاتھ سے جانے دیا اور تجربے سے نتائج اخذ کرنے سے قاصر رہے۔ ایسی ناکامیاں چشمۂ زندگی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور مکمل زندگی کے منازل طے کرنے میں سدراہ ہوتی ہیں۔ ہم حقیقت میں مدارج ترقی کے ابتدائی زینوں پر ہیں حالانکہ قدرت نے ہم میں اعلیٰ صفات وقوتیں ودیعت کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجربے نے ہماری مناسب وکما حقہٗ امداد نہیں کی اور نہ ہم نے اس کی اعانت کی طلب وجستجو کی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور ہم تجربہ کی تشکیل اور تنظیم تو واقعی کریں تو ہماری زندگی کی ترقی کی آخری منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ یہی نشوونما ہے۔ یہی ترقی کی راہ ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔

تجربہ کی قدر وقیمت صرف وقتی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم تغیر پذیر عالم میں رہتے ہیں اور مستقبل کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ ڈیوی کی

رائے میں تجربہ کو امروز و فردا کی شمولیت کا ماحصل اور مآل کار ہونا چاہیئے۔
ہم واقعات، رفتار و روش کو پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ کامیابی و ناکامی، حسن و قبح، امید و بیم ہمارے لئے بہت پر معنی اور اہم ہیں۔ ہم آئندہ تجربہ پر جس حد تک قابو حاصل کر سکتے ہیں اس کا انحصار ہماری اس قوت پر ہے کہ واقعات فردا کے آثار واقعات حاضرہ کی روشنی میں دیکھیں اور گزشتہ واقعات سے مستقبل کا اندازہ لگائیں اور اس طرح سابق نتائج کی روشنی میں موجودہ دور میں تبدیلی پیدا کریں۔ لیکن بہر صورت حقیقتاً ہماری زندگی حال ہی میں بسر ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ایک زندہ ہستی کسی حد تک مجبور اور آزاد ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ واقعات حاضرہ کا ردعمل کس طور پر واقعات فردا پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ذاتی تجربہ کو قابو حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا تجربی سائنس کی پیدا کردہ چیز ہے۔ سائنس کی جدید ترقی سے قبل تجربہ کا مفہوم صرف رسوم، روایات اور کورانہ تقلید تک محدود تھا۔ لیکن اب ماضی کا تجربہ اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے جدید و بہتر تجربہ کو ترقی کے مقاصد و اصول سے روشناس کرے۔ ہم کو صرف ماضی کا اعادہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ حوادث و سانحات کا انتظار کرنا چاہیئے کہ

وہ مجبوراً ہم میں تغیر پیدا کریں۔ ہم گزشتہ تجربات سے اس لیئے مدد لیتے ہیں کہ مستقبل کے تجربات بہتر، عمدہ اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر کیئے جا سکیں تجربہ خود اس طریق عمل کا نام ہے جو درستی و اصلاح کے تعین میں ہماری رہنمائی کرے۔

ڈنمارک کے ایک فلسفی کا قول ہے کہ ہم ماضی سے واقف ہوتے ہیں لیکن مستقبل ہمارا نصب العین ہوتا ہے۔ ڈیوی لکھتا ہے کہ ہمارا مستقبل اسی حالت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب واقعات گزشتہ ہمارے پیش نظر ہوں۔ اسی لیئے وہ تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے "تعلیم تجربہ کی اس تعمیر نو یا تشکیل نو کا نام ہے جو تجربہ کے معانی و مفہوم میں اضافہ کرتا ہے اور آنے والے تجربات کی رہبری کرنے میں فہم و ادراک کو مزید ترقی دیتا ہے"۔

بے شک ہر فرد میں تجربہ سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت بہت مختلف ہوتی ہے۔ علم النفس کی جدید تحقیق نے یہ بات ثابت کر دیا ہے کہ ہر فرد میں نہ صرف تجربہ و استقرا کی اعلیٰ صفتوں اور قوتوں میں بیّن فرق ہوتا ہے بلکہ ابتدائی ارتسامات کے استفادہ اور ان کو محفوظ کرنے میں بھی بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ تجربات بھی اپنی علمی قدر و قیمت کے لحاظ سے مختلف النوع ہوتے ہیں۔ خاصکر اسکولی تجربات

اگر انکا بچے کی خارجی زندگی سے مقابلہ کیا جائے - اسی لئے ان بچوں کی باتوں میں تسلسل کی کمی اور بے ربطی پائی جاتی ہے جو بہت بربادی، بیکاری و تباہی کا باعث ہوتی ہے -

ڈیوی اپنی تصنیف "مدرسہ اور معاشرہ" میں لکھتا ہے کہ بچے کے نقطۂ نظر سے مدرسہ میں سب سے زیادہ تضیع علم کا باعث یہ ہے کہ وہ ان تجربات کا آزادو صحیح استعمال مدرسہ کی چہار دیواری کے اندر نہیں کر سکتا جو اس مدرسہ کے خارجی اثرات و ماحول سے حاصل ہوتے ہیں - اس کے برخلاف وہ ان علوم کو بھی روزمرہ زندگی میں استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے جو وہ اسکول میں سیکھتا اور حاصل کرتا ہے - یعنی یوں سمجھئے کہ مدرسہ اور زندگی میں کوئی ربط نہیں اور دونوں کی دنیا الگ اور جدا جدا ہے - جب بچہ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ ان خیالات، ذوق، دلچسپی اور مشاغل کو اپنے ساتھ لاتا ہے جو اس کے گھر، ماحول و پڑوس میں غالب و قوی تر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو مدرسہ روزمرہ کے تجربات سے استفادہ نہیں کر سکتا وہ دوسرے طریقہ کو استعمال کرتا ہے تاکہ بچوں میں اسکول و درس کی دلچسپی پیدا ہو جائے -

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق مدرسہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تجربات

کو مہیا اور فراہم کرے جو تعلیمی اقدار رکھتے ہیں تاکہ تمام طلباء اپنی استعداد وقوت کے مطابق علم سیکھ سکیں۔ وہ "ہمارا تعلیمی مسلک" کے دوسرے مضمون میں مدرسہ کو قومی یا جماعتی زندگی کے مشابہ خیال کرتا ہے جہاں سوسائٹی یا معاشرہ کو ترقی دے سکیں۔ مدرسے کو لازم ہے کہ وہ اپنی اندرونی زندگی کی تکمیل معاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرے اور ایسے مواقع بہم پہنچائے جن سے فائدہ حاصل کر کے بچے اجتماعی مشاغل ومقاصد کو سمجھ لیں اور ایک حد تک اس میں حصہ لے سکیں۔ اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے ربط وتعلق نہیں رکھے گا تو وہ معاشری زندگی کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اور جو کچھ علم وہنر، لیاقت واستعداد بچے وہاں حاصل کریں گے وہ اس کی چہار دیواری تک محدود رہیں گی اور جب وہ اس چہار دیواری سے باہر نکلیں گے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

اس کی رائے میں مدرسہ ایک "مخصوص ماحول" کا نام ہے جو معاشرہ کا پیدا کردہ ہے۔ اور جہاں بچوں کے ذہنی اور اخلاقی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے اور جہاں ان کی جبلتیں انفرادی نشو ونما کے مطابق ڈھالی جاتی ہیں۔ اور جہاں ان کو اجتماعی مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ ڈیوی نے اس ماحول کی تین خصوصیات بیان

کی ہیں۔ مدرسہ کا ماحول ایسا ہو کہ جدید تہذیب و تمدن کے پیچیدہ مسائل و عناصر زیادہ سہل و آسان طور پر بچوں کے سامنے پیش کئے جائیں کیونکہ بچے بغیر تمثیل کے بآسانی سمجھ نہیں سکتے۔ مدرسہ کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ بچوں کے لئے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کو نوعمر طلبار سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرے۔ ابتدا میں آسان چیزیں سکھائے۔ اور ان کی مدد سے آگے چلکر زیادہ مشکل و پیچیدہ امور کی تشریح کرتا رہے۔

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب و تمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جاتے ہوں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں۔ اصلاح و ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً مفید ہیں اور مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ اس طرح مدرسہ طلبار کو ایک اعلیٰ تر معیار تمدن سے روشناس کردے گا اور وہ بڑے ہو کر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں گے۔

تیسری خصوصیت مدرسہ کے ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب عناصر ایک خاص توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ مرتب

کیے جائیں تاکہ تمدنی زندگی کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نوعمر بچے اور نوجوان جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بے بہرہ نہ ہو جائیں۔ لہٰذا اس مدرسے میں کسی فرقہ پرستی کی تنگ فضا کی جگہ وسیع قومی روایات کا وسیع تر ماحول بہم پہونچانا چاہیئے اور اس کو اتنا وسیع و فراخ بنانا چاہیئے کہ اس میں آفاقی انسانی تمدن کی روح پیدا ہو جائے۔ اس طرح افراد میں ہم آہنگی، وسیع النظری اور یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:۔ ؎

تا کجا در تہ بال گراں می باشی | در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز
ہر کہ از قید جہات آزاد شد | چوں فلک در شش جہات آباد شد

معیاری نمونے کا مدرسہ محض مثالی گھر ہے۔ جو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ تمام فرائض جو ادنیٰ معیار پر گھر میں انجام دئے جاتے ہیں اور جن کی ضرورت جدید صنعتی و اقتصادی نظام کے اتفاقات میں برابر پڑتی رہتی ہے۔ باضابطہ و منظم طور پر انجام دیئے جا سکیں (اسکول و سوسائٹی ۴۷۔۵۳)۔

جب ہم ڈیوی کے اس نظریۂ مدرسہ کا موازنہ اپنے مروجہ قومی

اسکولوں کے نظری و عملی مشاغل سے کرتے ہیں تو ہم ان دونوں میں بہت کم اشتراک عمل اور اشتراک مقاصد پاتے ہیں ۔ مدرسے حالانکہ اس مقصد سے قائم نہیں گئے جاتے کہ ان میں مستقل سکوت اختیار کی جائے ۔ وہ صرف علمی درس و تدریس کے مرکز ہوتے ہیں ۔ لیکن دونوں کے فرائض علیحدہ نہیں کئے جا سکتے بلکہ دونوں میں رشتۂ اخوت و اتحاد ہوتا ہے ۔ ڈیوی لکھتا ہے کہ مدرسے عموماً اس لئے ہوتے ہیں کہ طلباء استاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اس کے سبق کو سنیں یا سوالات کا جواب دیں ۔ جہاں بچوں کے ساتھ بجائے انفرادی حیثیت کے اجتماعی حیثیت سے برتاؤ کیا جاتا ہے اور جہاں بچوں میں جمود، انفعالیت، غیر اعتمادی، عدم طمانیت اور دوسروں پر مکمل اور غیر معقول انحصار کی عادت، فطرت کا جزو لاینفک بن جاتی ہے وہاں کے مدرسوں میں قومی زندگی، معاشری مواقع بالواسطہ ذہنی و اخلاقی اثر، خانگی زندگی، عمل کے نتائج سے تحصیل تجربہ وغیرہ کی امتیازی خصوصیات نہیں ہوتیں ۔ اس لئے اس معیار تک لانے کے لئے مدرسے کی نظری و عملی زندگی میں از سر نو مکمل تنظیم کی ضرورت پڑے گی ۔

عمرانی و اجتماعی تنظیم نو | ڈیوی کا خیال ہے کہ اگر معاشرہ کو ترقی

پذیر ہوتا ہے تو تجربہ کی انفرادی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اجتماعی تنظیم ناگزیر ہے۔ بچوں کی تعلیم معاشرہ کی مسلسل حیات کا ذریعہ ہے لیکن وہ معاشرے جو تعلیم کا واحد مصرف و استعمال اپنی حیات کی بقا، تعمیر عمرانی کا افادہ اور افزائش نسل کو تصور کرتے ہیں، وہ حالت جمود میں رہتے ہیں۔ ایک حرکی معاشرہ کا کچھ اور ہی فرض ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایسی تعلیم دے کہ جو تغیر پذیر معاشرتی نظام میں آنے والے واقعات کی رہبری کرے تاکہ معاشرۂ مستقبل، موجودہ معاشرہ سے بہتر اور اعلیٰ ہو جائے۔

ڈیوی اپنی تصنیف "انسانی فطرت و روش" میں لکھتا ہے۔ کہ حالات جدید کا غیر دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مسلسل، تدریجی، معاشی ترقی اور عمرانی اصلاح کا خاص ذریعہ بچوں کو تعلیم دینے کے مواقع کا استعمال کرنا ہے تاکہ مروجہ خیالات و خواہشات کو برتر و پاکیزہ کیا جا سکے۔ بچے اس زمانہ میں مقررہ رسوم و روایات سے پوری طرح متاثر نہیں ہوتے۔ ان کے غیر ارادی اور ممکن موجی مشاغل زندگی، واضح التغیر پذیرا آزمائشی، شوقی اور استعجابی ہوتے ہیں۔ بالغوں کی عادتیں مقابلتہً زیادہ متین، مستحکم و پختہ ہو جاتی ہیں۔ گردوپیش کے حالات و واقعات سے انکا متاثر ہونا لازمی ہے۔ البتہ وہ انتہائی کوشش و جدوجہد

سے تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ واضح طور پر ضروری اور احتیاجی تبدیلی کا شعور و احساس کرنے سے قاصر ہوں یا ان کے نقصانات کے برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ لیکن وہ آئندہ نسل کے لئے بہتر و مختلف زندگی کی تمنا کرتے اور خواہشمند ہوتے ہیں۔ لیکن نامعلوم مستقبل کے لئے تعلیم و تربیت دینا کیسے ممکن ہے۔ تعلیم اطفال لازماً بالغوں کے ذمہ ہوتی ہے جن کی عادات و قوت فکریہ قریب قریب مستحکم و پائدار ہوتے ہیں، عادات دائمی و استمراری راہ کو اختیار کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم بدبختی کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اخلاق و سیرت کی تخریب ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ درسی اداروں میں انقلاب پیدا کرنے اور ان مقاصد کی تکمیل کے وسائل حاصل کرنے کی کونسی راہیں ہیں؟ ڈیوی اس سوال کا جواب حسب ذیل الفاظ میں دیتا ہے۔

"تعلیم اطفال کو بارآور بنانے میں تاکہ معاشرہ کی ترمیم و اصلاح ہو بالغوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی برتر و بہتر ریاست کا مدون و باضابطہ نصب العین پیش نظر رکھیں۔ اگر کسی تعلیمی مہم میں یہ روح جاری ہو گی تو وہ یقینی اپنی غیر متحرک اصلی حالت پر قائم رہے گی اور اسکا انجام تشدد میں ہو گا۔ ہمارے لئے یہ امر

ناگزیر ہے کہ ان عادات و خصائل کی تشکیل و تعمیر کی جائے جو مروجہ خصائل سے زیادہ ذکی و زیرک، قوی الادراک، زود فہم، دور اندیشی میں ڈوبے ہوئے ہست و بود سے زیادہ واقف کار، زیادہ خالص و غیر مبہم، زیادہ زود حس اور اثر پذیر ہوں۔ ایسی صورت میں وہ نئے اور دشوار امور سے دوچار ہوں گے اور ان کے حل و اصلاح کی خود ہی غور و فکر کریں گے اس کے علاوہ تغیر پذیر معیار و اقدار کے باعث سماج کی مسلسل تعمیر نو کرنا انقلاب کی تخریب سے روکنے اور حصول استحکام کا واحد طریق عمل ہے۔ انتہائی جمود و غیر معقول سکون باغی و سرکش پیدا کرتا ہے۔ زندگی کی بقا تجدید و تعمیر پر قائم ہے۔ اگر حالات مسلسل تنظیم و تشکیل کے لئے نامساعد ہیں تو اسکا اچانک وقوع پذیر ہونا کسی نہ کسی وقت لازمی ہے۔ انقلابات کے رونما ہونے کے ذمہ دار وہ لوگ ٹھہرائے جائیں گے جو ہم آہنگی اور تطبیق کے بجائے رسوم کی بقا کو اپنا مطمح نظر رکھتے ہیں"۔

حیاتِ امروزہ کی اہمیت بقول ڈیوی تعلیم اور جدید تمدنی زندگی کا باہمی ربط و تعلق بے حد ضروری ہے وہ روسو کو تعلیم جدید کا پہلا اور سب سے بڑا پیغمبر مانتا ہے۔ اس کے نزدیک روسو کی حقیقی عظمت اور حکمت و دانائی کا راز

یہی ہے کہ اُس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو پورے طور پر سمجھ لیا کہ خواہ
تعلیم کا مقصد اعلیٰ کچھ ہو اسکا نقطۂ آغاز بچے کی شخصیت وذات ہے
جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رجحانات کا احترام اور
ان کی ہدایت معلم واستاد کا اولین فرض ہے تعلیم کا مقصد اولی صرف
یہ ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کیا جائے لیکن اس کے
یہ بھی معنی نہیں کہ ہم بچوں کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ نہ
دیکھنے دیں۔ اور ان کو ان فرائض وذمہ داریوں کے لئے تیار نہ کریں
جن سے ان کو مستقبل میں دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس بات پر
ضرورت سے زیادہ زور دینا بعید از عقل ہے۔ جو عملی نتائج ہوئے
وہ زیادہ مضر اور غیر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوا
کہ معلم بجائے اس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں قوتوں اور
دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے انھوں نے مستقبل کی توقعات
اور ضروریات کو اپنا نصب العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل
بدل دیا۔ اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے،
لیکن اس منزل تک پہونچنے کے لئے جس قدر درمیانی منزلیں راستے
میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اُتنی ہی اہم اور قابل توجہ
ہیں جتنی وہ آخری منزل تا اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی

اس کی نشو ونما کے ہر ہر قدم کو اس کے لئے معنی خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے۔ اس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ معلم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نو عمر بچہ ایک مخصوص شخصیت کا مالک ہے۔ انواع و اقسام کے جواہر و بینش بہا قوتیں اور صفتیں اس میں پنہاں ہیں۔ وہ مخصوص شوق و رجحانات کا مالک ہے جس کا دریافت کرنا اسکا فرض ہے اور جن کی تربیت اور ترقی کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اسکا خاص کام ہے۔

ڈیوی ان خیالات کی تائید میں روسو کی تصنیف ایمیل کا اقتباس اپنی کتاب "اسکول آف ٹوماروز" میں نقل کرتا ہے "ایک انسان کو وہ تمام باتیں جاننا ضروری ہیں جو بچے کے خیال میں غیر مفید اور فضول ہیں کیا بچے کو کچھ سیکھنا لازمی ہے؟ کیا وہ تمام چیزیں سیکھ سکتا ہے جو ایک انسان اور بالغ آدمی کو جاننا چاہیئے؟ ہمارا فرض ہے کہ ہم بچوں کو ایسی چیزیں پڑھانے اور سکھانے کی کوشش کریں جو اس کے لئے بحیثیت بچے کے مفید ہیں اور اگر ایسا کیا جائے تو بچے پورے انہماک سے سارا وقت صرف کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو اس عمر کے لئے تعلیم

و تربیت دیں جس عمر تک شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے؟ اور اس تعلیم و تربیت کو پس پشت ڈالدیں جو اس کی موجودہ ضروریات کے پورا کرنے میں ممد و معاون ہو۔ لیکن یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس کی تحصیل بے محل اور بے وقت ہوگی۔ جبکہ اس کو ضروریاتِ استعمال کا وقت آن پڑے۔ رُوسو لکھتا ہے کہ میں اس کے جواب دینے سے قاصر ہوں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اسکا قبل از وقت سکھانا ناممکن ہے کیونکہ ہمارا اصلی معلم تجربہ اور شعور ہے اور ایک بالغ آدمی اپنی ضروریات و حوائج کو بھی کبھی نہیں سیکھ سکتا جب تک کہ اس کو ان حالات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ہر بچہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ آئندہ چل کر بالغ و نوجوان ہوگا اس لئے اس کو انسان کے حالات سے روشناس کرنے سے شاید ہدایت کا موقع مل جائے لیکن اس کے لئے وہ تمام باتیں لاعلمی کی حالت میں رہنی چاہئیں جو اس کی عقل و سمجھ سے باہر اور بالاتر ہوں۔ میری پوری تصنیف تعلیم کے اسی بنیادی اصول پر مبنی ہے۔"

بچہ طفلانہ زندگی بسر کرتا ہے اور زندگی کی ہر منزل کی طرح وہ اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جو بالغانہ زندگی کا پیش خیمہ ہوتے ہوئے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ نشو و نما کی حالت و فطرت

اپنی سی ہے اس لئے ہر منزل کی کامیابی کا انحصار اس کی گزشتہ منزل پر ہوتا ہے۔ ہم ادنیٰ، مردہ و خالی الذہن عہدِ طفولیت پر مکمل وخوشگوار شباب کی زندگی کو استوار نہیں کر سکتے۔ جین پال رچیر کا خیال ہے کہ اگر شباب عہدِ زریں نہیں ہے تو پیری میل و فضلہ ہے۔ عہدِ شباب اسی وقت خوشگوار و دلچسپ ہو سکتا ہے جب عہدِ طفولیت ہمارے لئے سرسبز و خوشگوار رہا ہو۔ عہدِ بلوغ تمام قوتوں کی بتدریج ترقی کا نتیجہ ہے اور عہدِ شباب کی مکمل نشو و نما کے بغیر ناممکن ہے۔

ڈیوی کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علٰحدہ منزلِ مقصود نہیں وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل۔ بالفاظ دیگر اسکا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعہ سے انسان میں علمی، اخلاقی، معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ہوتی جائے۔ اور اس کی مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رہے۔ ایک واقعی تعلیم یافتہ و جاہل آدمی میں اصلی فرق یہی ہے کہ پہلے میں سیکھتے رہنے کی غیر محدود صلاحیت ہے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں۔ پہلے کی تعلیم ہمیشہ جاری رہتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی۔ دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ہوئی تھی تو اب بند ہے . . . . حیات بخش صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے، ہمیشہ متحرک رہے۔ جب علم میں

یا تعلیم میں جمود پیدا ہو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے۔

ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے ذوقِ انقلاب ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر تعلیم کا منتہائے مقصود یہ ہو کہ بچوں کی تمام موجودہ فطرتی قوتیں، رجحانات، جبلتیں، شوق اور دلچسپیوں کو بیدار کیا جائے۔ اور ان کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل کی جائے۔ تو یقیناً طلبار کی زندگی بدرجہا بہتر و افضل ہو جائے گی اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مستقبل کے لئے مکمل طور پر تیار و مسلح ہو جائیں گے۔ لیکن دماغی و اخلاقی ارتقائی برتری اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب طلبار خود بالارادہ اور اختیاری طور پر عملی قدم اٹھائیں۔ پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے۔

> "سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے یا نہیں اگر تعلیم کے معنی نشو و نما کے ہیں تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو بتدریج قوت سے فعل میں لائے۔ اور اس طرح افراد میں آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے نشو و نما کوئی ایسی چیز نہیں جو یوں ہی کبھی کبھی واقع ہو جایا کرے وہ تو ہر بار رفتہ رفتہ موجودہ کیفیات سے مستقبل کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ اگر مدرسہ کا ماحول اور

خارجی حالات ایسے ہیں جن میں بچوں کی موجودہ صلاحیتوں کو مناسب طریقے پر کام میں لایا جا سکتا ہے تو مستقبل جو حال ہی میں سے پیدا ہوتا ہے خود بخود بہتر اور خاطر خواہ صورت اختیار کرے گا غلطی یہ نہیں کہ بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کرنے پر زور دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور جد و جہد کا مرکز و مدار قرار دیا جائے۔ چونکہ واقعتاً یہ بات بہت اہم ہے کہ نوعمر طلبا کو اس زمانے کی زندگی کے لئے جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار کیا جائے اس لئے لازم ہے کہ ان کے موجودہ تجربات کو معنی خیز و گوناگوں بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس طرح غیر محسوس طریقہ پر حال مستقبل کی فکر خود بخود کر لے گا"

اس نظریہ کی رو سے تعلیم کے مطمح نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم لوگ ابھی تک اسی خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ بالغوں کے معاشرہ کے معیار کے مطابق بچوں کی نشوونما و تربیت ہونی چاہئے۔ علم، ذوق و شوق، عادات و اخلاق میں بچے بالغوں کے معیار پر جانچے و پرکھے جاتے ہیں۔ اور ہر شخص کی نظر میں اچھے بچوں کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں اور بڑوں کو بہت کم پریشان و دق کرتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بچے اپنی طفلانہ زندگی میں بزرگوں سے بالکل ذوق و شوق، مشاغل

اور اخلاقی معیار رکھتے ہیں اور یہی بچوں کے ذوق و شوق اور مشاغل ہر حصول علم کے لئے جو اس سے وابستہ ہیں بہت ضروری اور اہم ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہئے کہ بچے اس کے حاصل کرنے میں اپنے گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں اور موجودہ زندگی کے تجربات میں اضافہ کر سکیں تاکہ وہ مستقبل کے حوادث سے دوچار ہونے میں خضر راہ کا کام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کو از سر نو مدون کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

تدوین نصاب

اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ بچوں کو ایسے تجربات بہم پہونچائے جائیں جو سبق آموز ہوں۔ جو بچوں کے سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکیں یعنی بچوں کی حاجت تجسس رفع کرنے میں معین ہوں تاکہ بچے کھیل کود کی طرح اس کو اختیاری طور پر سیکھ لیں۔ تحصیل درس ہی ہمارا نصب العین نہ ہونا چاہئے۔ حصول علم کے معنی حفظ کرنے کے نہیں بلکہ اسکا مقصد اعلیٰ زندگی کو اور زیادہ دلچسپ اور کامیاب بنانا ہے۔ اس عملی پہلو کے بغیر ہمارے تجربات کی تعمیر نو میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ روسو نے اسی چیز پر زور دیا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ قدیم طرز تعلیم جس میں پرانے آیات و نشانات علوم کو

طوطے کی طرح رٹا دیا جاتا تھا مسترد کر دی جائے اور اس کی جگہ تحصیل تجربات کو خاص اہمیت دیجائے۔ بقول ڈیوی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا و مہیا کرے جو طلباء اور متعلم کے احساسات و رجحانات کو بیدار کرنے کے علاوہ اس کی حیات میں معین ہو۔ دوسری بہت اہم بات عمرانی ماحول کا پیدا کرنا ہے جو بچوں کی عادت و خصائل کی اصلاح ان کے اجتماعی احساس اور ان کی ذہنی و عقلی قوتوں کی نشو و نما کر سکے۔ مدرسے میں ایسے مشاغل ہونے چاہئیں جو عقلی تربیت اور سائنس کے معلومات حاصل کرنے میں آسانیاں بہم پہونچائیں۔ علمی تحقیقات، اختراع و ایجاد کے لئے بیشتر حصہ تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک ہندوستان میں مروجہ و مقررہ نصاب تعلیم میں ایسے مواقع بہت مشکل سے پائے جاتے ہیں۔ ڈیوی نے نہایت خوش اسلوبی سے اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

انسان کے جتنے مشترک اور اہم ترین مشاغل ہیں ان کا تعلق خوراک، مکان، لباس اور مکان کے ضروری سامان سے اشیا کے بنانے، ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع و وسائل سے ہے۔ چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضرورت اور آسائش

سے متعلق ہیں اسی لئے وہ انسانی جبلتوں کی گہرائی تک پہنچتی ہیں۔ اور ان میں جو معلومات اور اصول پنہاں ہیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اہمیت اور قدر رکھتے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ باغبانی، پارچہ بافی، لکڑی اور دھات کا کام، کھانا پکانا اور اسی قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور مدارس جدید میں داخل کئے گئے ہیں محض روزی کمانے کا ذریعہ ہیں تو ہم ان کی واقعی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک ناگزیر مصیبت معلوم ہوتے ہیں جس کو محض حصولِ معاش کی خاطر گوارا کرتے ہیں۔ لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جن میں یہ کام کئے جاتے ہیں۔ دورِ حاضرہ کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اہمیت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے تعلیم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے، اور ان کا سائنس پر۔ مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کئے جاتے بلکہ اپنی داخلی قدر و قیمت کی بنا پر۔ جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواہش سے آزاد ہو جاتے ہیں تو ان کے ذریعہ سے

ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں جو بجائے خود مفید ہیں اس وقت وہ واقعتاً دماغ کی آزاد تربیت کا باعث ہوتے ہیں۔

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈیوی نے بحیثیت ناظم ٹنکا گو ابتدائی اسکول اور مدرسین کی مدد و مشورہ سے ان مشاغل کا انتخاب کیا جو بچوں کے لئے بے حد مفید ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نصاب تعلیم کو حسب ذیل سوالات کے پیش نظر مرتب کیا۔

اول، کیا یہ ممکن ہے اور کیونکر کہ مدرسے کو بجائے تعلیمی و تدریسی مرکز بنانے کے جہاں صرف چند مضامین کی تربیت ہو اس میں گھر اور گرد و پیش کی زندگی سے تعلق اور عملی ارتباط پیدا کیا جائے اور کونسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ مدرسے اور روزمرہ کی زندگی میں جو وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے یک قلم مفقود ہو جائے؟

دوم۔ کونسی صورت اختیار کی جائے کہ تاریخ، سائنس، آرٹ، اور دیگر فنون لطیفہ اصلی زندگی میں قطعی اور حقیقی فائدہ پہنچائیں اور چھوٹے سے بچے کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ اسکا حاصل کرنا عمدہ اور قابل قدر ہے؟

سوم۔ ظاہری شعبوں کی تعلیم (مثلاً لکھنا، پڑھنا، ہندسوں کا استعمال)

ہیں اور حال کی زندگی میں کس طور پر باہم ارتباط پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ بچے ان مضامین میں غیر معمولی شوق و دلچسپی حاصل کریں اور ان کو واقعتاً اس بات کا خیال ہو کہ وہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں ؟

چہارم - بچوں کی طرف انفرادی توجہ کس طرح مبذول کی جا سکتی ہے؟

ڈیوی نے ان تمام مسائل پر ہر پہلو سے خوب غور و خوض کرنے کے بعد تدوین نصاب میں حسب ذیل مشاغل کو شامل کیا جو بچوں کی مکمل تعلیم کے لئے بہتر و مفید ہیں۔

مدرسوں میں طلبار کاغذ، گتا، لکڑی، چمڑے، کپڑے، سوت، مٹی، ریت اور دھاتوں کا کام کرتے ہیں۔ کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے بغیر؛ اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انھیں بہت چیزیں سیکھنی اور کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً کاغذ کاٹنا، تہ کرنا، سوراخ کرنا، ناپنا، ڈھالنا، ماڈل بنانا، نمونے کاٹنا، گرم کرنا، ہتوڑے، آری و رینتی سے کام کرنا یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ مشاغل کے سلسلہ میں کرنے پڑتے ہیں مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کی تفریحی سفر کے لئے جانا، باغبانی، کھانا پکانا، سینا پرونا، چھپائی، جلد سازی، کپڑا بننا، رنگ بھرنا، تصویر کشی، ڈراما کرنا، کہانیاں کہنا، اور لکھنا پڑھنا نہ صرف اس مقصد سے کہ ایک خاص

فن سیکھنا ہے جو مستقبل میں فائدہ پہونچائے گا بلکہ اس خیال سے کہ یہ عملی مشاغل موجودہ اغراض و مقاصد کی تکمیل میں معین ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب طلبا میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے وہ اپنے مشاغل کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں تو وہ ان کو اور زیادہ سرگرمی، شوق و انہماک سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدرسے کے مشاغل میں خاص طور پر جس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ مضامین نصاب کا ربط ہے یعنی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور مستقل ہو بلکہ تاریخ و جغرافیہ، ریاضی و ادب، سائنس و فلسفہ، علم نباتات، علم حیوانات، علم زراعت، وغیرہ کے درمیان باہمی تعلق و ربط ہو اور اس کے ساتھ ہی طلبا کی زندگی و تجربات سے بھی، تاکہ بچے اپنے گرد و پیش کے مشاغل، تعلقات اور کاروبار کو اچھی طرح سمجھیں اور جب زندگی کے پیچیدہ اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑے تو ان کے حل کرنے میں زیادہ دشواری و پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

ڈیوی کا مدرسہ تھوڑے ہی عرصہ تک قائم رہا لیکن اس نے تعلیمی دنیا میں ایسا بیش بہا اضافہ کیا کہ اسکا اثر چہار دانگ عالم میں بہت گہرا اور مستقل ہوا۔ اس عملی مدرسہ نے وہ کامیابی حاصل کی کہ

ڈیوی نے تمام دنیا سے مسلّم الثبوت استاد اور معلم ہونے کا لوہا منوا لیا۔
اس معلم اور مفکر نے اپنی تصنیف "مستقبل کے مدرسے" میں ان
تمام مدرسوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو انھیں اصولوں پر قائم کئے گئے
ہیں۔ ان کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے اور ہر مدرسہ اپنی انفرادی
کاوش و تجربہ سے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ ان مدرسوں میں
جو انھیں اصول پر کامیابی کے ساتھ کام کر رہے ہیں مسٹر جانسن کا
اسکول واقع فیر ہوپ۔ پروفیسر جے۔ ایل۔ میریم کا مسوری ابتدائی
اسکول، گیری (انڈیانا) کا پبلک اسکول وغیرہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔
پروفیسر ایلسورتھ کولنگس (Prof. Ellsworth - Collings). چودہ پندرہ سال سے مسوری کے دیہاتی مدرسہ میں
ان اصولوں پر عملی تجربہ کر رہے ہیں اور تجربات و مشاہدات، عملی مشاغل
اور سائنٹیفک نتائج کو ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بچوں
کی ضروریات و مقاصد زندگی کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا تھا۔
روزمرہ کے کام کی کامیابی و ناکامی کو دیکھ کر نصاب مرتب کیا۔ اور
بچوں ہی کی رائے کے مطابق تعلیم دیتے رہے۔ انھوں نے مقررہ
مضامین کو بالکل اہمیت نہیں دی لیکن اگر ضروری سمجھا تو ان کو داخل
بھی کر لیا۔ انھوں نے زندگی اور اسکول کے درمیان رشتۂ اتحاد

(مو انسست کو قائم کیا۔ روزمرہ کا دستور العمل (۱) قصہ گوئی، (۲) تعمیری کام (۳) کھیل کود (۴) تفریحی سفر پر مشتمل تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بچے اپنے مشاغل کا حسن انتخاب کر سکیں اور ان کو نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ انجام دیں۔ اور اس طور پر ان میں خلقی انس، روحانی محبت، اخوت، مساوات، دیانتداری، حسن اخلاق، وفاداری، نیک دلی، رحم، قومی روح، سماجی روح اور عملی زندگی پیدا کر دیں۔ پروفیسر کلپیٹرک (Prof Kilpatrick) مشہور و معروف پروفیسر ٹریننگ کالج نے اس مدرسہ کی کامیابی پر بہت عمدہ رائے کا اظہار کیا ہے۔

ہندوستان میں مسٹر میگی نے موگا اسکول کی بنا اسی منصوبی طریقے (Project Methods) پر ڈالی ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ یہاں بچوں کی مکمل اور عملی تربیت کے لئے ایسا ماحول پیدا اور فراہم کیا گیا ہے جس سے بچے نصاب تعلیم اور زندگی کے مشاہدات و تجارب میں ربط قائم کر سکیں۔ موجودہ واردھا اسکیم بھی اسی اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے اور منصوبی طریقے کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسی نظریہ سے کسی حد تک تجاوز کر کے اور ہندوستانی ماحول کو پیش نظر رکھ کر شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور (مرحوم) نے شانتی

نگرانیاں اور شہری نگرانیاں کو قائم کیا۔ انھوں نے عملی ارتباط اور ذہنی تعاون کو خاص طور پر ملحوظ رکھا تھا۔ جہاں بچوں کی شخصیت کا احترام کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان ہی کی فطرت خوابیدہ میں وہ جوہر پنہاں ہیں جن کو بیدار کرنے سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔ بقول ٹیگور "ہر طفل نوزائیدہ دنیا میں پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے"

دوسرا مدرسہ جامعہ ملیہ ہے جہاں بچوں کو اسکولی زندگی اور عملی زندگی کے تعلق سے روشناس کیا جاتا ہے اور پروفیسر ہاورتھ کے اس قول پر عمل ہوتا ہے کہ مدرسہ کو بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہونا چاہیئے۔ جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔

باب دوم

جان ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر

مرکزیت طفل | جان ڈیوی نے ۱۸۹۹ء میں اپنی تصنیف "اسکول اور معاشرہ" میں لکھا ہے کہ اب

تعلیمی دنیا میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں وہ مرکز کشش کو منتقل کر رہے ہیں۔ انقلاب و تبدیلی کی نوعیت کوپر نیکس[1] کی طرح ہے جس نے علم ہیئت کے مرکز کو زمین سے آفتاب کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ آج اسی طرح تعلیمی دنیا میں بچہ آفتاب کی پوزیشن اختیار کر رہا ہے جس کے گرد تمام تعلیمی آلات و ذرائع گردش کر رہے ہیں۔ بچہ مرکز ہے اور اسی کے ارد گرد نظام تعلیم کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ الفاظ الہامی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں انقلاب کی جھلک نمایاں ہے لیکن یہ حقیقت ہے جو تعلّی اور مبالغہ سے بالکل مبرّا ہے۔ ڈیوی کی اس تحریر نے تعلیمی دنیا پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور اس میں اس کے مندرجہ ذیل اصول خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

۱۔ ڈیوی نے بچے کے فطری میلانات، جبلّی رجحانات اور طفلانہ ضروریات پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس نے اساتذہ و معلمین کو اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ بچے کی نشو و نما مضامین و نصاب

---

[1] کوپر نیکس پروشیا کا باشندہ تھا۔ ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں وفات پائی۔ وہ دنیا کا پہلا ہیئت داں و منجم تھا جس نے اجرام فلکی کی حرکت کی واضح تحلیل کی اور بطلیموس کے خلاف یہ ثابت کیا کہ اس نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے نہ کہ زمین۔

سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مدرسوں میں اسی بات کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہئے اور اس کی اشاعت و ترویج کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات کی داغ بیل اٹھارہویں صدی عیسوی میں ڈالی گئی تھی اور ہربارٹ کے پیروؤں نے بھی شوق اور دلچسپی کی اہمیت کو سراہا اور اس کی تلقین بھی کی تھی۔ جو مدرسے ان کی تعلیمات کے اثر سے قائم کئے گئے تھے ان میں یہی روح کارفرما تھی یعنی عہد طفولیت کی اہمیت۔ لیکن انھوں نے جو معاشرتی ورثہ یا ترکہ اور طور وطریقہ پر تاکید اور پانچ درجوں کے رسمی اصول (formalism of five steps) پر زور دیا تھا۔ اس نے علمیت کے نظم ونسق کو اور زیادہ محدود اور جکڑ دیا۔ اور اساتذہ کی پوزیشن کو زیادہ اقتدار اور اہمیت دیدی۔ عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خاص کر ہمارے ملک ہندوستان میں چند مضامین ونصاب کا طوطے کی طرح رٹ لینا ہی علمیت کے مرادف خیال کیا جاتا ہے اور یہ اسپرٹ عمومیت کے ساتھ تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاری ہے۔ ڈیوی نے اس نظریہ کے خلاف کھلی بغاوت بلند کیا اور دنیا کو یہ بتایا کہ مضامین، نصاب اور علمی مشاغل کو تنہا سے مقصود تصور

کرنا سراسر غلطی ہے۔ وہ تو ایک ذریعہ اور راستہ ہے جس پر قدم رکھنے کے بعد بچے اپنی فطری جبلتوں کی نشوونما اور قدرتی رجحانات کی افزائش اور تشکیل کر سکتے ہیں اور اس کی جسمانی اور ذہنی قوتیں حساس و بیدار ہو سکتی ہیں۔ ڈیوی کے نقطۂ نظر سے مدرسہ کا یہ فرض عین ہے کہ وہ بچے کی بالیدگی اور ترقی کو معاشرتی ماحول اور اجتماعی فضا میں پوری آزادی سے نشوونما پانے اور معاشرہ کے سرچشموں، علوم و فنون، مشاغل اور آرٹ سے پوری طرح سیراب ہونے دے کیونکہ سماج ایک جیتا جاگتا ماحول ہے۔

تعلیم اور تجربہ

۳۔ ڈیوی کا اعتقاد ہے کہ تعلیم، تجربات کے حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی خیال کو اپنی تصنیف "بچہ اور نصاب" میں یوں ظاہر کیا ہے "نفس مضمون کو خارجی اثر سے بچوں کے اس طرح ذہن نشین کرنا کہ وہ دماغ میں گھر کر جائے ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ سیکھنا موثر ہے (بغیر بیرونی اثر کے) اس کی مثال عضوی ہضم کی سی ہے جو اندر سے شروع ہوتا ہے۔" وہ اپنی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" میں اسی حقیقت کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ تعلیم تجربات کی مسلسل تعمیر نو کا نام ہے اور تجربہ کی از سر نو تشکیل و تجدید اجتماعی و معاشرتی آسودگی اور رضامندی کو وسیع اور

تعمیق کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افراد میں اس کے (تجربہ کے) طور و طریقہ پر قابو پانے کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تعلیم تجربہ کے ہم معنی اور مرادف ہے اور جو کچھ ہم سیکھتے ہیں وہ ہماری عملی جد و جہد کا ثمرہ ہے تو مدرسوں کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام مشاغل کو مہیا کریں جن کے بغیر مدرسے تعلیمی چہل پہل اور چشمۂ رواں نہیں بن سکتے۔ مدرسوں کا کام اور ان کی حقیقت اور اہمیت کا اندازہ صرف اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ طلباء میں یہ استعداد و قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نازک مواقع سے دوچار ہونے اور نئے تجربات کے پیش آنے کے باوجود ثابت قدم اور مستحکم رہیں۔ اور گزشتہ آزمودہ تجربات کی مدد سے زمانے کے جدید مواقع اور پیچیدہ حوادثات کو مطیع و منقاد کریں اور نہایت اطمینان، سکون، اور خندہ پیشانی سے مشکلات کی گتھیوں کو سلجھائیں

دانائی اور غور و فکر انسان کی قابلیت و لیاقت کا سنگ بنیاد ہے بغیر اس کے کوئی شخص پیش آنے والے نئے واقعات پر نہ تو قابو پا سکتا ہے نہ گزشتہ تجربات کے نتائج سے کوئی خاص استفادہ کر سکتا ہے اور نہ نئے پیچیدہ مسائل کی گرہوں کو کھول سکتا ہے۔ بہت کم اسکولوں میں اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ

بچوں کی دماغی نشوونما مکمل طور پر ہو سکے اور ان کی قوت فکریہ پوری آزادی کے ساتھ ترقی پذیر ہو کر اعلیٰ مدارج تک پہونچ سکے۔

غور و فکر کا صحیح مقصد انسانی تجربات کی تعمیر و تشکیل ہے اور انسان مشکل مسائل سے دوچار ہوئے بغیر قوت فکریہ کو معرض عمل میں نہیں لا سکتا۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ انسان اسی وقت غور و فکر کرتا ہے جب پیچیدہ حالات اور نئے مسائل و سوالات کا پہاڑ اس کے سامنے حائل ہو جاتا ہے اور اس کی دشواریاں معمے سے زیادہ مشکل اور فلسفے سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی حالت میں کسی عوض اور چارہ کار کی تلاش لازمی ہو جاتی ہے۔ تشویش و پیچیدگی کے علاج کا مطالبہ اس کی قوت فکریہ میں عزم و استقلال پیدا کرتا ہے اور اس طرح قوت فکریہ انسان کا ایک فطری جزو بن جاتی ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر | تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام | میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات | فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

شوق و کوشش

۳۔ ڈیوی کا عقیدہ اصول "شوق و کوشش" یعنی (Interest + Effort) قابل توجہ ہے۔ جس کا گہرا اثر تعلیمی دنیا میں عملی طور پر پڑا ہے۔ اور جو اس کے

نظریہ تعلیم بے معنی تجربہ کا نتیجہ و ماحصل نہیں ہے۔ لفظ "شوق" کا رواج تعلیمی دنیا میں اسی کی کاوش ذہنی کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک "شوق و کوشش" میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ اپنی تصنیف "شوق و کوشش" کے صفحہ ۷ میں اسی خیال کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ کسی شئی، خیال اور انجام کی خارجیت کو مسخر کرنا خودی (self) کا کام ہے۔ کیونکہ شئی یا انجام عام طور پر خودی سے جدا اور الگ ہوتا ہے اس کو دلچسپ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مصنوعی ترغیبات و تحریکات سے اپنے احاطہ میں لانے کی حاجت ہوتی ہے اور وہمی تحریص سے توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ شئے احاطۂ خودی سے باہر ہے اس لئے محض قوت عزم و ارادہ سے اپیل کی جائے اور سعی و کوشش کو جس میں "شوق" کا شائبہ بھی نہ ہو مرکز ثقل بنایا جائے۔

تمام علمائے تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ شوق کا اصلی سرچشمہ یہ ہے کہ جس بات یا واقعہ کو سیکھنا یا جس عمل کو پیش کرنا ہو اس میں اور ترقی پذیر نفس (self) میں تطابق اور ہم آہنگی پائی جائے اس شوق کی ترقی کا دارومدار عامل (یعنی خود بچہ) کی ذاتی بالیدگی پر ہے۔ اور اسی وجہ سے اسکا آمرانہ تقاضا ہوتا ہے اگر عامل (یعنی بچہ)

کو اپنی شخصیت کی تکمیل مقصود ہے۔ اگر تطابق (یعنی نفس اور شوق کی غیر شعوری ترقی کا تطابق) کی اس حالت کو ایک مرتبہ حاصل کرلیا جائے تو اس وقت نہ تو ہم کو قوت ارادہ سے اپیل کرنی پڑے گی اور نہ اس بات پر زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا کہ ان اشیا کو دلچسپ بنائیں۔

ڈاکٹر فرینک منیک مرے ڈیوی کے "شوق و کوشش" کے متعلق لکھتا ہے کہ بہت سے سن رسیدہ لوگ اس کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ خیال نہ کریں گے۔ پرانی لکیر کے شیدائیوں کا فتویٰ ہوگا کہ یہ خیال محض مذاق و استہزا ہے۔ کرنل پارکر نے ڈیوی کے خیال "شوق" سے بہت متاثر ہوکر غیر معمولی فریفتگی ظاہر کی۔ اس بات کو محسوس کیا کہ بچے کو بجائے نصاب و مضامین کا ماتحت بنانے کے خود مرکز و محور بنانا ترقی کی ایک نئی شاہراہ ہے اور اس صراط مستقیم پر گامزن ہونا کامیابی و فلاح کی دلیل ہے۔

سماجی ادارہ

۴۔ ڈیوی کا ایمان ہے کہ مدرسہ سماجی ادارہ ہے اور ہماری تمام اجتماعی و عمرانی ترقی کا وراثتاً ایک حصہ ہے۔ مدرسہ ایک چھوٹی جماعت اور سوسائٹی کا دوسرا نام ہے جس کا طور و طریق بعینہ جماعت کا چربہ اور نمونہ ہوتا ہے۔ وہ کسی

طرح خارجی دنیا کی راہ و روش سے علیحدہ اور متضاد نہیں ہوتا۔ ۱۸۹۹ء
میں ڈیوی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا
ہے جس میں سماج کی زندگی کا بہترین مرقع ہونا چاہیئے۔ جس میں
سماج کے انواع و اقسام کی حرفت و صنعت کا پورا انعکاس ہو۔
جس میں چمنستان زندگی کے رنگ برنگ کے پھول اپنے پورے
حسن و جمال کے ساتھ ہوں اور جس میں آرٹ، تاریخ، سائنس،
فلسفہ، فنون لطیفہ اور دیگر مفید علوم کی تازہ اور پاکیزہ روح موجود ہو۔
یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مدرسہ کو سماج کا آئینہ اور
نقش ثانی ہونا چاہیئے۔

جب مدرسہ میں ایسی چیزیں جاری ہوں گی اور بچوں کی ایسی
تربیت اور نشو و نما ہوگی کہ وہ مدرسہ کی چار دیواری کے اندر معاشرہ
کے باکار ممبر بننے کی صلاحیت اور لیاقت پیدا کر سکیں گے اور ان میں
ایثار، انکسار، خدمت خلق، خود اعتمادی، اور اپنی مدد آپ کرنے کی
استعداد ہوگی اور کشتی حیات کے کھینے کی جو مہارت تامہ حاصل
کر لیں گے اور بحر زخار کے تلاطم و تموج کی بالکل پروا نہ کریں گے
اور منزل مقصود تک پہونچنے میں شجاعت اور عزم و استقلال سے
کام لیں گے، تو ہم سوسائٹی کی خدمت میں ایسے افراد پیش کر سکیں گے

جو فخر و ستائش کے قابل، احترام و عزت کے لائق اور معاشرہ کی زندہ یادگار ہوں گے ۔ مدرسہ کا حقیقی مقصد بچوں میں قوت تعمیر و تخلیق کا ابھارنا ہے اور ان کی مخفی تخلیقی قوتوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا ہے ۔

اخلاقی تعلیم

ڈیوی نے اخلاق پر بہت زور دیا ہے اور اس کے خیالات کا اثر اس شعبہ میں بہت گہرا پڑا ہے ۔ اسکا خیال ہے کہ تعلیم کا صحیح مقصد ہر فرد میں قوت فکریہ پیدا کر دینا ہے کہ وہ اپنی کشتی حیات کو سماجی افادہ کے لئے پار لگا سکے اور اس کی شخصیت کا وجود جماعت و معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہو ۔ وہ پند و نصائح کے رسمی لکچروں اور وعظوں کو ناقص سمجھتا ہے ۔ اس کے نزدیک تعلیم و اخلاق کی مفارقت کا باعث قول و عمل کا نفاق ہے ۔ انسان کا اخلاق اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب وہ اس کو ذاتی تجربہ کے ساتھ حاصل کرے اور تجربہ و عمل سے وہ (یعنی اخلاق) اس کی فطرت ثانیہ بن جائے ۔ وہ لکھتا ہے کہ بعض اخلاقی کیفیات کا سماجی تعلق ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان کو اخلاقیات کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ جن میں راستبازی، ایمانداری، تقویٰ، حیا، رواداری اور ہر دل عزیزی کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔ یہ وہ

مرکزی فضائل ہیں جن کے گرد دوسری خوبیاں گردش کرتی ہیں۔
اخلاقیات کے دائرے میں نیک کرداری، خصلت اور سیرت
شامل ہے اور سیرت بحیثیت مجموعی انسانیت کے مرادف ہے۔
صفاتِ حمیدہ سے متصف ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ عملی زندگی
میں دوسروں سے میل جول، ربط و تعلق اور لین دین کیا جائے۔
اور فطری قوتوں کو اعلیٰ مدارج تک پہونچانے کی انتھک کوشش
کیجائے۔ مدرسوں اور اسکولوں کا نظم و نسق، نصاب اور تعلیم و
تدریس سب اسی وقت قابل قدر ہوسکتے ہیں جب ان میں سماجی
و اجتماعی روح کارفرما ہو۔ تادیب، فطری ترقی، تمدن و تہذیب
سماجی استعداد وہ اخلاقی صفات ہیں جن سے ہر انسان کو متصف
ہونا چاہئے۔ صرف ذاتی خوبی ایک بے معنی شئے ہوگی اگر وہ دوسروں
کے لئے مفید اور کارآمد نہ ثابت ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں
کہہ سکتے ہیں کہ خدمتِ خلق حُسنِ اخلاق کا بہترین مظہر اور کمال تزکیۂ
نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ ع۔

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست

ڈیوی نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی اجزا قرار دئے ہیں
اور بتایا ہے کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر و تکمیل میں انھیں صفات کو شعوری

طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

ا۔ "قوتِ عمل یا کارکردگی کی صلاحیت (Force of - Efficiency in Execution) ہم اکثر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہے یا بہت پختہ ہے۔ اس سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے انجام دینے میں استقلال، محنت، جرأت اور حوصلے سے کام لیتا ہے۔ یہ فعالی صفات ہیں جو بحیثیت مجموعی ہماری سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کرکے آخرکار کامیابی کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل میں نہیں لاسکتا۔ عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ہیں یا برے۔ ہر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حائل ہوتی ہے جس میں انسان کو کاوش اور جدوجہد سے کام لینا پڑتا ہے۔ وسائل کی تنظیم کرکے اور مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لاکر اپنے ماحول کو اپنا مددگار بنانا پڑتا ہے۔ جو شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لے کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اسکا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کرسکتے ہیں

لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ منزل مقصود تک پہونچ جائے گا
. . . . ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کرکے دکھائے کسی طرح اپنے عمل کا سکّہ اپنے ماحول پر جمائے ۔ یہ وہی خواہش ہے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر و تخریب میں ظاہر ہوتی ہے ۔ اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو سمجھنا اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں ، اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچہ میں مفید عادتیں پیدا ہوں یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے ۔

" قوتِ عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشرتی نقطۂ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو ۔ اس کے لئے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ (Judgment) اور ذکاوتِ احساس (Delicate Personal Sensitiveness)

۳ ۔" انسانی سیرت کا عقلی اور ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوتِ فیصلہ کی تربیت کی جائے ۔ یہ قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے ۔ جب ہمارا علم مربوط اور منتظم ہو ، جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے اور تکمیل مقاصد میں مدد دے ، جب اس کی بدولت ہم ہیں معاملات کی سمجھ ، احساس تناسبا ،

موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہو جائے۔ اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں۔

۳۔ "تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص میں قوتِ عمل اور قوتِ فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوتِ احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا۔ لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوتِ عمل ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو معاشری اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں، جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ہوتے ہیں، جن میں روحِ انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی مطلق حس نہیں، وہ تالاب کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا .... معلم کا اور مدرسے کی تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ طلبا کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوتِ احساس پیدا ہو، وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں۔ جب انھیں کسی اہم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے

تو وہ اس کی طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنی شخصی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں۔ ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اسکا ردعمل دوسروں پر کیا ہوگا اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی اِن کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگے گی۔ جب انسان کے نفس میں ذکاوتِ احساس کی بدولت ہمدردی و فراخدلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اسکا شخصی نصب العین اجتماعی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بے جا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری ان مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو۔"

الغرض جن مدرسوں میں علم مسلسل عمل اور پیہم مشاغل کے ساتھ سکھایا جاتا ہے۔ وہاں کے ماحول میں سماجی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا معاشرہ ہو جاتا ہے جس میں بیرونی زندگی کے تجربات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس چھوٹے معاشرے میں بچے میل جول اور ارتباط و اختلاط کے باعث زندگی کے نئے نئے

تجربات اخذ کرتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ اس سرچشمہ سے سیراب ہوکر ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ سماجی زندگی میں مستعدی سے حصہ لے سکیں۔ وہ اس قابل بن جاتے ہیں کہ دنیا کے تغیرات کے دوش بدوش چل سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنی زندگی میں بھی تغیر و تبدل کر سکیں۔ یہی حُسنِ اخلاق ہے۔ اسی کا نام سماجی افادہ ہے اور یہی علم و عمل کا ارتباط و اتحاد ہے۔ انہیں خصائص کو مدرسوں کا منتہائے مقصود ہونا چاہئے تاکہ یہ فرد کی اخلاقی زندگی کے رگ و ریشہ میں پوری طرح سرایت کر جائیں اور اس کی سرشت کا ایک جزو لاینفک بن جائیں۔

سماجی لیاقت و صلاحیت

ڈیوی اور بیگلے، نظریہ سماجی لیاقت (Social Efficiency) کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ ان دونوں امریکی مفکروں نے اس خیال کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پھیلایا ہے۔ ان کی تمام تحریریں اسی خیال سے لبریز ہیں۔ ڈیوی نے خاص طور پر "سماجی لیاقت" کی بڑی اشاعت کی ہے اسکا خیال ہے کہ ہر بچے کو سماجی لیاقت کیلئے تیار کرنا اسکول کا فرض ہے۔ وہی شخص سماجی لیاقت رکھتا ہے جو جونک کی طرح دوسروں کا خون چوس کر زندہ نہیں رہتا بلکہ خود

اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہوکر اپنی زندگی کا خالق ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنی کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کی ترقی میں روڑے نہ اٹکائے۔ بلکہ دوسروں کا ہاتھ بٹانے میں ہر وقت مستعد رہے اور سماج کی ترقی میں ہر ممکن کوشش کرے۔

بقول ڈیوی سماجی زندگی دو عناصر کا مجموعہ ہے (۱) معاشی لیاقت (۲) مدنی لیاقت، جب تک یہ دونوں اوصاف ایک انسان میں جمع نہ ہوجائیں اس وقت تک ان کو "سماجی لیاقت" کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ معاشی لیاقت اسی وقت ممکن ہے۔ جب ہم فطری قوتوں کو سماجی افادہ کے لئے پوری طرح استعمال کریں۔ سماجی لیاقت میں صنعتی و حرفتی آسودہ حالی اور قابلیت شامل ہیں۔ ہر انسان کے لئے ذریعہ معاش حاصل کرنا لازمی ہے اور وہ بغیر اپنے پیٹ کی فکر کئے سماج کے لائق نہیں بن سکتا۔ جن ذرائع سے روزی کمائی جاتی اور خرچ کی جاتی ہے ان سے باہمی تعاون اور لین دین پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو شخص یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنی ذات اپنی اولاد اور متعلقین کے لئے روزی حاصل کرسکے اور دوسروں کے سہارے زندہ رہتا ہے تو وہ مفت خور اور طفیلی سے

زیادہ وقعت نہیں رکھتا - اسی لئے وہ تجربات زندگی سے محروم رہتا ہے۔ جوانان کے بہترین معلم اور ہادی ہیں - اگر وہ صنعتی پیداوار کے صحیح مصرف و استعمال کو نہیں سیکھتا تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنی شخصیت کو ضایع کرنے کے علاوہ دوسروں کی مفید دولت کو برباد نہ کردے اور ایک مچھلی کی طرح سارے تالاب کو گندہ نہ کردے -

جمہوری نقطۂ نظر سے ہر انسان کا یہ فرض عین ہے کہ وہ اپنی زندگی اور قسمت کا مختارِ کل بن جائے اور اپنی زندگی کی ایک منزلِ مقصود ٹھہرائے ؎

کچھ مقصد لے کر آتا ہے اس دنیا میں جو آتا ہے
محرومِ عمل جو رہتا ہے وہ جیتے جی مر جاتا ہے

عموماً اس اصول کے خلاف کسی ایسے بہتر پیشہ اور برتر روزگار کو اختیار کرتے ہیں جس میں فطری رجحانات اور جبلّی قوتوں کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ دولت اور موروثی پیشہ کو جانچ کا طریقہ ٹھہرایا جاتا ہے۔

"مدنی لیاقت" کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ لوگ اس قابل ہو جائیں کہ انسانوں اور تدابیر کو نہایت عقلمندی سے جانچ سکیں - قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں دانستہ حصہ لے سکیں - یہ انسان کی ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے - اسی ذریعہ سے انسان اپنی فطری

قوتوں کو عملی طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ یہی انسان میں باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کی انفرادی اہمیت کو عملی طور پر سمجھتا ہے۔ تجربات کا مبادلہ ہوتا ہے قوم کی سماجی پیداوار میں حصہ لینے کے [illegible] موجزن ہوتے ہیں۔ انسان کو دوسرے انسان کے تجربات سے مستفید ہونے کا زریں موقع ملتا ہے اور اس طور سے کام بہتر طریقہ پر انجام پاتا ہے۔ اشیاء کا اختراع، آرٹ سے حظ اٹھانا، فنونِ لطیفہ سے تازگی حاصل کرنا۔ فرصت کے وقت کو صحیح استعمال کرنا، دولت کا موقع اور محل سے خرچ کرنا، ضرورت کے وقت مستعد رہنا اور اپنی تمام قوتوں کا بہ ہیئت مجموعی بہتر استعمال کرنا۔ مدنیت کے مرادف وہم معنی ہے۔ الغرض حقیقی مدنیّت سے مراد دماغی اشتراکیت، عملی اشتمالیت اور وسیع النظری ہے، جو سماجی طبقات کی خلیج کو فنا کر دیتا ہے، جو تجربات کی آمد و رفت کو نہیں روکتا اور جس میں ہمدردی اور خوش مزاجی، بھلائی اور نیکی شامل ہیں۔

بنیگلے کے نقطۂ نظر سے "سماجی لیاقت"، وہ معیار ہے جس سے تعلیمی ذرائع ان تمام تجربات کا انتخاب کر سکیں جو افراد کے ذہن نشین کرتا ہوں۔ یہی میزان ہونی چاہیئے کہ جو خصائل و عادات بچے اسکول

میں سیکھیں وہ ان کی زندگی میں سماجی لحاظ سے مفید ہوں۔
برٹرینڈ رسل جو انگلستان کا بہت بڑا مفکر ہے وہ اپنی تصنیف "اجتماعی نظم اور تعلیم" میں "تخلیقی مدنیت" کے پانچ اوصاف بیان کرتا ہے جس سے متصف ہوکر انسان مکمل شہری کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

۱۔ قوتِ انشا۔ (Initiative) یعنی ہر تحریک اور سماجی کام میں پیش قدمی کرنے کی صلاحیت تاکہ ہر اجتماعی افادہ کے لئے ملک کا ہر شہری اپنے فرائض کا احساس کرکے اس پر عملی قدم اٹھائے۔

۲۔ قیادت (Leadership) یعنی ملک کی سیاست اور تمدن کو برقرار رکھنے کے لئے دوسروں کا دست نگر نہ ہو بلکہ ہر شہری میں یہ اسپرٹ (روح) موجود ہو کہ اگر قوم کے جہاز کا ناخدا مر جائے تو وہ اس سے بہتر و لائق شخص کی خدمت کو پیش کرسکے گا۔

اِذَا سَیِّدٌ مِّنَّا خَلَا قَامَ سَیِّدٌ قَؤُوْلٌ لِّمَا قَالَ الْکِرَامُ فَعُوْلٗ

ترجمہ۔ ہم میں کا کوئی سردار مر جاتا ہے تو اس کی جگہ پر دوسرا سردار ہو جاتا ہے۔ (اور) اس کا قول و فعل بزرگوں کے قول کے مطابق ہوتا ہے۔

۳۔ تادیب و انضباط۔ (Discipline) یعنی ایک ایسے اصول و نظم کے ماتحت کام کرنا جو سماج کے افادہ کے لئے ناگزیر ہو اور جس سے

اجتماعی شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔

۴۔ اتحاد و اشتراک عمل (Cooperation) یعنی سماج و قوم کی خدمت باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے کرنا تاکہ انفرادی نشوونما کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی بھی ترقی ہو اور ہر شہری میں خودغرضی کے بجائے ہمدردی و ایثار کے جذبات پیدا ہوں۔

۵۔ رواداری (Tolerance) یعنی دوسروں کے جذبات و اختلافات کا لحاظ رکھنا اور ان کو آزادی رائے، آزادی تقریر اور آزادی عمل دینا تاکہ چمنستان قوم کی آبیاری ہو سکے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے

باب سوم

تخلیقی مدنیت کیا ہے؟

تخلیقی مدنیت کے لئے آزادی اور انفرادیت کا وجود اور انکا احترام لازمی ہے۔ انھیں سے افراد کی نشوونما اور تکمیل اور ذہانت میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ وہی اشتراک عمل کا باعث ہیں۔

اگر اخلاقی لحاظ سے دیکھیں تو ان کے ماتحت دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنی چاہئے۔ نفسیاتی اعتبار سے اختلاف اور کشمکش کی وجہ سے ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیمی رو سے فرمانبرداری، ہمدردی، اجتماعی خدمت اور ذمہ داری کی افزائش ہوتی ہے۔ جدید سائنس نے زمان و مکان کے قیود کو فنا کر دیا ہے اور ذرائع آمد و رفت میں وسعت و ہمہ گیری پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اچھے شہری کے لیے عالمگیر شہری ہونا ناگزیر ہے۔ جس میں وسیع النظری اور آفاقی ہمدردی کے جذبات اس طرح موجزن ہوں کہ وہ تمام نوع انسانی کو ایک خاندان خیال کرے جیسی کہ اسلام کی تعلیم ہے۔ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند   کہ در آفرینش ز یک جوہر اند (سعدیؒ)

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا   کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا (حالیؒ)

اور وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابن آدم کی تقسیم چاہتا ہے حقارت کی نظر سے دیکھے، مولانا حالی نے انسانیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ ؎

چیست انسانی؟ بیدن از تپ ہمسایگاں   از سموم نجد در باغ عدن بریاں شدن

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس   در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

آتشِ قحطے کہ در کنعان بسوزد باغ و کشت   سر فراز تخت مصر از تاب وے بریاں شدن

آزاد شہری تیار کرنے کے لئے تاکہ وہ تخلیقی اعمال سے معاشرہ کی از سر نو تنظیم کر سکیں حسب ذیل اوصاف لازمی ہیں:۔

۱۔ سماجی ذمہ داری کا احساس غالب ہونا چاہئے جس میں دوسروں کی فلاح و بہبود اور ہر انسان کی آسائش اور آرام کا خیال شامل ہے۔ ان میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ عوام کی غربت، افلاس، جہالت، بیماری اور سماجی مشکلات کو دور کر سکیں۔ دوسروں کی خوش حالی کے لئے جدوجہد کرنا، ذاتی اغراض کو پس پشت ڈالنا، عوام کی فرمانبرداری کے سامنے خواص کی اطاعت کو نظر انداز کرنا، حقیقی مدنیت کے مرادف ہے۔

۲۔ قوم اور سماج کے کاموں میں پورے انہماک اور مستعدی سے حصہ لینا، فرائض کی انجام دہی میں پیچھے نہ ہٹنا اور اجتماعی ورثے سے پوری طرح استفادہ کرنا ان کا فرض عین ہے۔ اگر وہ اجتماعی ورثے کے عوض کوئی خدمت نہ کریں تو ان کی پوزیشن طفیلی سے زیادہ نہ ہوگی۔

۳۔ ان کو آزادی کا سرشار اور شیدائی ہونا چاہئے، وہ آزادی جو نہ صرف انفرادی ہو بلکہ سماجی اور ملی بھی ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حقیقی رواداری اور سچی محبت بھی ان کی سرشت کا ایک جزو ہونا چاہئے۔

۴۔ بین الاقوامی سیاست اور بین الملّی مسائل پر غور و فکر لازمی ہے۔ اس سے سلجھے ہوئے خیالات کی افزائش ترقی پاتی ہے۔ جدید سیاست سے کافی دلچسپی لینا، بین الاقوامی تحریکات سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی خوب واقفیت ہونا، جمہوری ممالک میں ایسا ہی ضروری ہے جیسے حیات انسانی کے لئے ہوا، پانی اور روشنی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بچے کو مدنی زندگی کے لئے کس طور سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور اسکول میں کون سے ذرائع استعمال کئے جائیں کہ اچھی مدنیت کی تعلیم و تربیت ہو سکے۔ اچھی مدنیت کے لئے مختلف سماجی اداروں کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ مغربی و مشرقی اسکولوں میں جہاں جہاں آزادی اور اشتراکِ عمل کا دور دورہ ہے وہاں مدرسے نہایت کامیابی کے ساتھ اچھے شہری پیدا کر رہے ہیں۔ اچھے شہری پیدا کرنے کے لئے مکمل سماج کی تشکیل بھی لازمی ہے جہاں بچوں کو ایسے مواقع بہم پہونچائے جائیں کہ وہ آزادی کے ساتھ مدنی فرائض کو عملی طور سے انجام دے سکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روح ہر عمل میں جاری و ساری ہو اور اسکولوں کا نصب العین بجائے ذاتی غرض اور شخصی منفعت کے متحدہ خدمت، جماعتی منصوبے اور معاشرتی مقاصد ہوں۔

اسکولوں میں ایسی سوراجی حکومت قائم کی جائے جس میں بچے خود حصہ لے سکیں اور جس میں قیادت، ضبط و تادیب، باہمی آمد و رفت، ذمہ داریوں اور فرائض کی تقسیم، عہد و پیمان کے لحاظ وغیرہ کے لئے خاص طور پر مواقع دئے جائیں۔ ان تمام اوصاف کو بیرونی زندگی میں کامیاب بنانے کے لئے بچوں کو ایسے مواقع دئے جائیں کہ وہ خارجی دنیا اور مسائل زندگی سے پوری طرح آشنا ہو سکیں۔ اس قسم کے مشاغل میں جو انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں طلباء کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں اعتماد ذات، صلاحیتِ عمل اور ذوقِ سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا سیکھتے ہیں۔ ہر اچھے مدرسے میں "اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق اور اہتمام سے رائج ہو جاتے ہیں مثلاً مدرسے کا رسالہ نکالنا، مختلف قسم کی علمی و ادبی انجمنیں قائم کرنا، تعلیمی سیر و تفریح کا اہتمام کرنا، مجلس مباحثہ کا چلانا، حکومت خود اختیاری کا انتظام، فرصت کے اوقات میں دست کاری کا مشغلہ اپنے شوق سے فنون لطیفہ میں سے کسی فن کی مشق"۔ ۵۱

---

۵۱ اصول تعلیم از سیدین۔

جدید نظریۂ تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے طریق ڈالٹن، منیٹرم، مونٹیسوری طریقۂ تعلیم اور گیری اسکیم وغیرہ عالم وجود میں آئے ہیں۔ ان طریقوں میں افراد کی نشو و نما کو امتیازی حیثیت دی گئی ہے اور ان کی تکمیل کے لئے انواع و اقسام کے مشاغل اور طرح طرح کے سامان و آلات فراہم کئے جاتے ہیں جن کو وہ اپنے شوق سے عملی جامہ پہناتے ہیں۔ گیری اسکیم میں خاص طور پر "سماجی معائنہ" (Social Survey) کے فرائض کو اپنے طور پر انجام دینے کے لئے ذمہ داری بچوں ہی کے سر عائد کی جاتی ہے۔ معلم کی حیثیت صرف ایک دوست اور رہبر کی ہوتی ہے جو راستہ دکھاتا ہے لیکن اس راستہ پر چلنا طلبا پر چھوڑ دیتا ہے۔ سماجی معائنہ میں بچوں کو اپنے گاؤں یا شہروں کی اجتماعی، اقتصادی، تعلیمی، اور حفظان صحت وغیرہ حالات کا معائنہ کرنا پڑتا ہے اور ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو مختلف سماجی خدمات کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً شبینہ اسکولوں کا قائم کرنا، اسپتالوں کی دیکھ بھال، غربا کی امداد، صفائی کا کام، اخلاقی برائیوں کی اصلاح، حفظانِ صحت پر لکچر اور جسمانی خدمات وغیرہ؛ نیز اس کے ساتھ بین الاقوامی حالات کا تفحص اور تنقیدی مطالعہ تاکہ بچے زندگی کے مسائل عصریہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ جو لوگ

علم اور تہذیب کو قدیمی روایات اور آثار تک محدود رکھتے ہیں اور علوم جدیدہ کو بے معنی خیال کرتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم علوم بھی ہمارے لئے اس واسطے ضروری ہیں کہ نئے علوم کی عمارت بغیر اس بنیاد کے تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ حقیقی تمدن میں جغرافی حدود کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک عالمگیر اور وسیع چیز ہے۔ برٹرنڈ رسل کا خیال ہے کہ عالمگیر شہری بننے سے ہمہ گیر انسانی معاشرہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اقوام کے نصب العین کے مطالعہ کا کافی موقع ملتا ہے۔ اور حال کو ماضی اور استقبال کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تعلیم میں مسائل حاضرہ، جدید تاریخ، سیاسی اور اقتصادی امور، اجتماعی معاملات اور سماجی اداروں کے ارتقاء شامل ہونا چاہئے۔ نصاب میں ان مضامین کی عدم موجودگی سے ہر شہری کو سخت نقصان پہونچے گا۔ اسکولوں میں ان معلومات کو دلچسپ اور آسان بنانے کے لئے رسائل و اخبارات کا مطالعہ، مکالمہ، مباحثہ کی ترویج نیز فضلاء کے مقالات کا سننا بچوں کے لئے لازمی قرار دیا جائے تاکہ بچوں میں فطری شوق پیدا ہو اور وہ ہر مسئلے پر گفتگو کرنے اور سمجھنے کی پوری کوشش کریں۔ اس کے علاوہ بچوں کو

تاریخ محض پرانے واقعات، جنگ و جدل، قتل و خونریزی، سنایا نہ عظمت و جلال اور بھولے بسرے افسانوں کا مجموعہ سمجھ کر نہ پڑھائی جائے۔ جیساکہ عموماً ہمارے مدارس میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ تو عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں۔ بلکہ تاریخ کی تعلیم بہ حیثیت "ارتقاء تمدن انسانی" کے پیش کی جائے۔ اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کرایا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے اور جس سے تاریخ، نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے۔ تاریخ کا فرض یہ ہے کہ وہ اس عمل ارتقا کی توضیح کرے اور طلباء کو یہ بتائے کہ مسلسل انسانی سعی اور جدوجہد سے تمدن کی ہر شاخ میں کس طرح ترقی ہوئی۔ اگر طلباء اسکا مطالعہ غور و فکر سے اور صحیح نقطۂ نظر سے کریں گے تو وہ انسانی ارتقاء کی نوعیت، اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے لگیں گے، وہ اپنے اجتماعی و معاشری فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیں گے اور اپنے حقوق سے اچھی طرح استفادہ کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بحیثیت مجموعی علم تاریخ انھیں یہ بتائے گا کہ جدید و قدیم تمدن کے رنگا رنگ تار و پود کے ملنے سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا۔ وہ کون سے محرکات

تھے جو مختلف ایجادات، اختراعات، انکشافات اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے اور ان چیزوں نے کس طرح زندگی کے نئے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی۔

یہی حال جغرافیہ کا ہے، علم جغرافیہ چند اصطلاحوں اور رسمی ناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی معاملات اور ان کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کے مطالعہ میں معاشری اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے۔ تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تاریخ تو انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے، یعنی اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ گذشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ جغرافیہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کے تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی نشوونما کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ بہرحال دونوں کو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سروکار ہے۔ جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطہ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور کس طرح

اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح و ترقی کے لئے لوگوں کا باہمی تعاون ضروری ہے اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے۔ اسی کے ساتھ جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے۔ اور اس طرح طالب علم کی عمرانی تربیت میں مدد دیتا ہے۔

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادّی مفاد کے حصول اور صنعت و حرفت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا در اصل اس زمانے میں اخلاقی و عمرانی تربیت کا جزو لازم ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس کی مدد سے طلبا موجودہ تمدّن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان فطرت کی طاقتوں کو مسخّر کر کے انھیں مقاصد کے لئے کام میں لاتا ہے۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے یہ تعلیم دی تھی۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط (۴۵:۱۱)

اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخّر کر دیا ہے (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرّف میں دیدی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو)۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ

اسی نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے

جَمِیعاً ط (البقرہ)

بنایا۔

هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُمْ
مِنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝
يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ
وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ط
(۲:۱۶)

اسی نے تمہارے لیئے آسمان سے پانی اتارا کچھ اس میں سے تم پیتے ہو کچھ درخت اگتے ہیں جس میں جانور چراتے ہو اور وہی خدا تمہارے لیئے کھیتی، زیتون اور چھوہارے اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهِ ط
(۲-۱۶)

اور اس نے تمہارے لئے رات، دن، چاند اور سورج کو مسخر کیا اور ستارے اسکے حکم سے مسخر ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً
تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ
فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ط (۱۲-۱۶)

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو مسخر کیا تاکہ تم اس سے گوشت کھاؤ اور اس سے زیور کی قیمتی چیزیں نکالو جو تمہارے پہننے میں کام آتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں تاکہ تم خدا کے فضل کو ڈھونڈو اور شاید کہ تم اسکا شکر کرو۔

حضرت شیخ سعدی نے اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے ۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

سائنس کے مطالعہ سے ہر شہری پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی علمی تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکا کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ اب وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہے اب اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے۔ ...... اچھے شہری کو سائنس کا مطالعہ صحیح طریقہ پر کرنا چاہیئے تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھ شریک ہو سکے جن کی بنیاد سائنس کی علم پر ہے۔ جان ڈیوی لکھتا ہے:۔

"نصابِ تعلیم میں بھی سائنس کا کام وہی ہے جو اس نے نسل انسانی کے لیئے انجام دیا ہے یعنی تجربہ کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راہیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ہوا ہے نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع

معنی دیدئے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آسکتے ہیں۔ اور انجام کار فلسفیانہ نقطہ نظر سے سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔"

"ادب انسانی خیالات و جذبات، انسانی آرزوؤں و امنگوں، انسانی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ترجمان اور انسان کے قلب و روح کی واردات اور جدوجہد کا آئینہ دار ہے۔ اس کے ذریعہ سے شہری نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات حاصل کرتے ہیں بلکہ قدیم اور جدید خیالات و جذبات اور دنیا کے بہترین مفکرین کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ان کی نظر زیادہ وسیع، ان کی ہمدردی زیادہ عام، ان کی قدر شناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ ترین ادب ایک شہری کو نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے، نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گذشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے۔ بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کا جوہر ہیں نشوونما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے۔ وہ ایک شہری کو براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرایہ

میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر اس کے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے ...... عالی اور صالح ادب کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقہ پر ایک شہری کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کر جائے، ادب تربیت اخلاق کا ایک موثر ذریعہ ہے اور بقول ارسطو اس سے روحانی تنقیہ ہو جاتا ہے۔ زبان کی مشق کرانے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات و تجربات کے مطالعہ پر زور دیا جائے اور اس کی وساطت سے ہر شہری کو بنی نوع انسان کے بہترین خیالات و احساسات میں شرکت کا موقع ملے۔"

(اصول تعلیم از خواجہ غلام السیدین)

باب چہارم

بامقصد و مفید تعلیم کا نظریہ

ووکیشن کی تاریخ ڈیوی نے ووکیشن (Vocation) کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے، جو اس کی تحریروں میں جابجا مذکور ہے۔ لیکن اس نے اس لفظ کو کسی محدود معنی میں

نہیں استعمال کیا جیسا کہ عام طور پر لوگ ووکیشنل (Vocational
اور ٹیکنیکل (Technical) یعنی صنعتی کو ہم معنی سمجھتے ہیں -
اسکا نظریہ ہمہ گیر ہے جس کی وسعت میں تمام باکار اور بامقصد
تعلیم (جس میں نظری و عملی تعلیم بھی شامل ہیں) آجاتی ہے۔ وہ اس
نظریہ کا سب سے بڑا علمبردار ہی نہیں بلکہ مخترع اور موجد بھی ہے۔
اُسکا نظریہ تعلیمی دنیا میں اپنا سکہ جما چکا ہے اور اسکا اثر اس صدی
میں بہت گہرا ہوا ہے۔

یوں تو افلاطون کے زمانہ سے ووکیشن کا لفظ رائج ہے لیکن
۱۹ ویں صدی میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ کارل
مارکس (Karl Marx) مصنف "سرمایہ" (The capital)؛
کروپاٹکن (Kropotkin) مصنف "کھیت، کوٹھیاں اور
اور کارخانے" (Field, Factories & Work Shops)؛
جرمن سوشلسٹ ہینرچ شولز (Heinrich Schultz)-
مصنف "اشتراکی جمہوریت کی اسکولی اصلاح" - (School -
Reforms of Social Democracy)؛ پال نیٹارپ -
(Paul Natorp) مصنف "اشتراکی عینیت" (Social -
Idealism)؛ اور اینا سمسن (Anna Simsen) بانی

المانوی بنیادی مصلحین کی مجلس وغیرہ مفکرین کی تحریروں نے اسی خیال کی ترویج و تبلیغ کی اور ذہنی و رسمی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، لیکن آجکل جو عمومیت اس کو حاصل ہوئی ہے وہ ڈیوی ہی کا اعجاز ہے۔

ووکیشن کا مفہوم

حرفتی تعلیم کا سراغ لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے یہ خیال مروّج تھا کہ ذہنی تعلیم فراغت وفرصت (Leisure) کے ہم معنی ہے۔ علم کو علم ہی کی غرض سے سیکھنا تعلیم کا منتہائے مقصود ہے، اسی پر ذہنی و روحانی ترقی کا انحصار ہے، اور اس میں حس و حرکت کو بالکل دخل نہیں۔ کلچر (Culture) کا مفہوم بھی عصر جدید میں ایک خاص معنی رکھتا ہے، وہ شخصی تہذیب اور ذاتی شائستگی کے ساتھ وابستہ ہے، اس میں بعض ایسی کیفیات اور شعور کی شمولیت ہے جو سماجی افادہ سے معرّیٰ ہے۔ جان ڈیوی پیشہ و حرفت (Vocation) کی تعریف یوں کرتا ہے کہ "وہ مشاغل حیات کی ہدایت کا نام ہے جو انسان کو دوسروں کی عظمت و اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ کرتا ہے، کیونکہ اس کے نتائج سے دوسرے متاثر ہوتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔" پیشہ کا ضد نہ تو فرصت ہے

اور نہ کلچر، بلکہ تعلیم کا بلا مقصد اور بلا نصب العین کے حاصل کرنا اور طفیلی کی طرح سماج پر آسرا لگانا اُسکا ضد ہے۔ پیشہ عملی تسلسل و حرکت کا نام ہے، اُس کی فرمانروائی میں آرٹ کی فطری قوتوں کی ترقی ہوتی ہے، سائنس کی اختراعی قوتیں ابھرتی ہیں، مدنیت کی روح پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اور خود حرفہ و پیشہ اوج کمال حاصل کرتے ہیں۔

ووکیشن کو صرف دائرہ حرفت تک محدود رکھنا سخت غلطی ہے کیونکہ پیشہ اور حرفت ہی ووکیشن کا منتہائے مقصود نہیں ہے ووکیشن کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُس کے احاطہ میں وہ تمام انسانی مشاغل آجاتے ہیں جو انسان کے ہر بامقصد شغل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسان ایک ہی کام کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، وہ مختلف فرائض حیات کا مجموعہ ہے۔ طرح طرح کے مشاغل، انواع و اقسام کے فرائض اسی کے ذمہ ہیں، جن کا انجام دینا اس کے لئے ناگزیر ہے۔ صرف فنافی الحرفۃ ہوجانا سماج کیلئے سمِ قاتل ہے۔ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، رونق و زینت، گفتار و کردار، لین دین اور آمد و رفت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ کتنا ہی بڑا صاحب کمال

اور اپنے فن میں طاق ہو لیکن گھر بار، خاندان، دوست احباب، پڑوسی، اعزہ واقارب کے ربط و تعلقات سے آزاد نہیں رہ سکتا ہے اور نہ ان فرائض سے منھ موڑ سکتا ہے۔ جس طرح وہ دوسروں کے سہارے اور مدد پر جیتا ہے، دوسرے بھی اسکا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اُس کے تعلقات دوسروں سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ بھی دوسروں کے تعلق سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ فلسفی ہو یا شاعر، مُغنّی ہو یا مصوّر، انجینیر ہو یا ڈاکٹر، مدیر ہو یا پروفیسر ملّاح ہو یا سنجّار، کاشتکار ہو یا مزدور اس کے لئے کسی عورت کا شوہر کسی باپ کا بیٹا، کسی بیٹے کا باپ، کسی سوسائٹی کا رکن اور کسی اسٹیٹ کی رعایا ہونا ناگزیر ہے۔ جب تک وہ دوسرے شعبہ ہائے حیات سے تعلقات نہیں رکھتا اپنے شغل زندگی میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ باہمی تعلقات و تعاون سے اُسے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ ہمدردی و رواداری اس کا مسلک ہونا چاہئے جن کے بغیر زندگی بسر کرنا محال ہے۔

وُوکیشن کی اہمیت تعلیم ان ہی لوگوں کا فریضہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کوئی مشغلہ

امتیازی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پیشہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کی امتیازی قوتوں اور سماجی خدمات کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ انسان اسی وقت خوش و خرم رہ سکتا ہے جب وہ اپنی فطری قوتوں کے مطابق کسی پیشہ کو اختیار کرے اور اس کو حسن و خوبی سے انجام دینے کی کوشش کرے۔ جب تک انسان اپنے مقصدِ حیات کو متعین نہ کرے گا ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صحیح شغل (Vocation) وہی کہا جا سکتا ہے جب انسان کے جبلی رجحانات پوری آزادی کے ساتھ نشو و نما پائیں، اس کی ترقی کی راہ میں کم سے کم مشکلات حائل ہوں اور زیادہ سے زیادہ سرور و بہجت ہو۔ اس عملی فائدہ یہ ہوگا کہ قوم اور معاشرہ کو اس فرد کی پوری خدمت حاصل ہو سکے گی۔ ازمنۂ قدیمہ میں جب کہ غلامی کا رواج عام تھا خاص طور پر اس بات کی کمی تھی کہ بہت سے بہترین ذی استعداد اور با مذاق لوگوں کی خدمت سے سماج مستفید نہ ہو سکتی تھی۔

افلاطون کے نقطۂ خیال سے تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ ہر شخص کی انفرادی قوت و صلاحیت کو جانچے اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہر ممکن کوشش کرے۔ کیونکہ اسی ترقی کی بنیاد پر سماج کی ترقی کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے، اور یہی وہ ذریعہ ہے

جس سے معاشرہ کی ضروریات کے مطابق جامعیت پیدا ہو سکتی ہے۔
یہاں افلاطون نے ایک لغزش کی ہے۔ اُس نے ووکیشن
(Vocation) کے مطمح نظر کو محدود کر دیا ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے
کہ ووکیشن ایک مسلسل با مقصد شغل کا نام ہے۔ جو تعلیم صنعت و حرفت
کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے وہ پائدار اور مستحکم ہوتی ہے یہی علم
و عمل کا سنگم ہے؛ اسی سے تمام جبلتوں اور خصلتوں کا ظہور ہوتا ہے
اور یہی انفعالیت (Passivity) کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس کی
ایک ہی منزل مقصود ہوتی ہے۔ وہ بچوں کے قوائے فکریہ سے اپیل
کرتی ہے۔ اسی کے سبب تمام کورانہ لائحۂ عمل، متحرک اور حیاتی عمل
سے تبدیل ہو جاتے ہیں اور افعال و اشغال میں زندگی کی لہر دوڑ
جاتی ہے۔ چونکہ تمام مشاغل ترقی پذیر ہیں، اور ایک زینے سے دوسرے
زینے پر بتدریج پہنچتے ہیں اس لئے تمام رکاوٹوں اور نامساعد حالات
کے استیصال کے لئے فطانت اور غور و فکر کو خضر راہ بنانا ہمارا فرض ہے۔

پیشہ و حرفت سے معلومات و خیالات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور
علم و ذہن کی ترقی ہوتی ہے۔ وہ ایک محوری پوزیشن اختیار کرتا ہے
جس پر تمام تجربات گردش کرتے ہیں، وہ ایک منبع ہے جس سے
واقعات و معلومات کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، وہ ایک گہوارہ ہے

جس کی آغوش میں تجربات کی افزائش ہوتی ہے۔ ایک وکیل، ایک طبیب، ایک معمل (Laboratory) کا محقق، ایک سرپرست، ایک شہری جو اپنے مدنی فرائض و حقوق سے دلچسپی لیتا ہے اور اپنے منتہائے مقصود کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہے، وہ غیر شعوری طور پر اپنے شغل و حرفت کی تکمیل کرتا ہے، اور وہی شغل و پیشہ اسکا مرکزِ ثقل بن جاتا ہے۔

کسی پیشہ کے سیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ پیشہ ہی کے ذریعہ سیکھا جائے۔ تعلیمی طور و طریقہ کا انجام اور حیاتِ امروزہ کا بہترین استعمال ہی انسان کو کسی پیشہ کا ماہر اور کامل بنا سکتا ہے۔ ہر انسان کا ہر زمانہ میں ایک ہی پیشہ رہا ہے اور وہ یہ کہ زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ ذہنی و اخلاقی ترقی کو پیشِ نظر رکھنا۔ عہدِ طفولیت اور سنِّ بلوغ میں جبکہ انسان آزاد فضا میں رہتا اور معاشی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، اس وقت یہ خیال زیادہ غالب رہتا ہے۔ مگر استبدادی سماج میں دوسری ہی دنیا ہوتی ہے! وہاں نئی زمین اور نیا آسمان ہوتا ہے! وہاں نہ تو آزادی اس کی ملکیت میں ہوتی ہے اور نہ ذمہ داری اس کی معین و مونس بنتی ہے۔ اس فضا میں جن لوگوں کی پرورش ہوتی ہے وہ ذہنی ترقی کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے۔ طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ ادنیٰ کے درمیان ایک

وسیع خلیج حائل ہوتی ہے اور اس طرح سماجی زندگی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اس لئے لازمی ہے کہ ابتدائی دور میں پیشہ کی تعلیم بلاواسطہ ہونی چاہیئے۔ جس میں بچے کی صرف فطری رجحانات اور جبلّی خواہشات کا لحاظ رکھا جائے؛ ایسے مشاغل منتخب کیئے جائیں جو اُس کے طبعی میلانات کے مطابق اور اس کی مجموعی ترقی میں معین ہوں۔ یہی طریقہ ہے جس سے بچے کا صحیح فطرتی میلان بتدریج معلوم ہو سکے گا، جس کو وہ آئندہ زندگی میں استعمال کرے گا۔ وہی اسکا مخصوص پیشہ بن جائے گا اور ایک مرتبہ انتخاب کرنے کے بعد وہ اس کی زندگی کا رفیق ہو جائے گا۔ لیکن یہاں اس بات کو ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ جو پیشہ انسان اپنے لئے اختیار کرے اُس میں امتدادِ زمانہ کے مطابق تغیر و تبدّل بھی ضرور کرتا رہے کیونکہ اس تغیر پذیر عالم میں ہر آن اور ہر لمحہ نئی تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو شخص پیہم نئی تعمیر کرتا رہے گا وہی فلاح کی راہ پر گامزن ہوگا۔

موجودہ مواقع و خطرات

گزشتہ زمانہ میں حقیقتاً حرفتی تعلیم کا زیادہ چرچا تھا حالانکہ وہ تعلیم ووکیشن (Vocation) کے نام سے موسوم نہ تھی۔ عوام کی تعلیم منفعتی تھی جس کو نوآموزی (Apprenticeship) کے نام

سے یاد کرتے تھے یا تحصیل تجربات کے لقب سے پکارتے تھے۔ اسکولوں میں عام طور پر تین آر "Three R's" (ریڈنگ، رائٹنگ اور آرتھمیٹک) کی تعلیم مروّج تھی جس کی ضرورت ہر پیشہ والے کو پڑتی تھی لیکن کسی مخصوص پیشہ میں تیار ہونے کے لئے دوسروں کے دارالعمل (Laboratory) میں جانا پڑتا تھا جو اسکول کی تعلیم سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی تعلیم حرفتی تھی، گو وہ اس کو اس نام سے یاد کرنا معیوب خیال کرتے تھے۔ صرف انھیں پیشوں کو پیشہ تصور کیا جاتا تھا جن میں جسمانی محنت اور عرق ریزی ہوتی تھی، جن کا مطمح نظر کسی قسم کا صلہ اور انعام یا کسی بڑے شخص کی خدمت ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جرّاح اور طبیب کے پیشے کی وقعت حجّام کے پیشہ سے زیادہ نہ تھی۔ ظاہری نمائش، شخصی زیبائش، حلقۂ احباب کا جمع کرنا بھی ایک پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ آجکل بھی اعلیٰ تعلیم ایک خاص طبقہ کے لئے محدود ہے جس کا حصول انھیں لوگوں کا اعلیٰ مقصد ہوتا ہے۔ وہ تمام تعلیم جس سے معلم، ادیب اور لیڈر پیدا ہوتے ہیں غیر حرفتی خیال کی جاتی ہے اور اس کو کلچر کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ "ادبی تعلیم جس سے ایک مصنّف، ایک ایڈیٹر

اور ایک صحیفہ نگار کی تربیت ہوتی ہے، وہ پیشہ کے خلاف کلچر کی آواز بلند کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ وہ جس تعلیم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اس میں وہ خود بھی گرفتار ہیں جس تعلیم کو وہ ذہنی و تمدنی تعلیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ خود ایک مخصوص پیشہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک مخصوص پیشہ کی تربیت حاصل کی ہے اور وہ اپنا کام اس لئے مستعدی سے کرتے ہیں کہ اس کے بغیر معاشی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے" ذہنی اور حرفتی تعلیم میں کوئی تفاوت نہیں ہے، اگر تفاوت ہے تو بامقصد اور بے مقصد تعلیم میں۔ ہر وہ تعلیم جو بامقصد ہوگی جس سے انسان اختیاری زندگی بسر کر سکے گا۔ جس سے مدنیت کی لیاقت اور معاشرہ کا باکار ممبر بننے کی صلاحیت پیدا ہوگی وہی حرفتی و افادی تعلیم ہوگی، اسی کا نام شغل ہوگا اسی کو ووکیشن کے دائرہ میں رکھا جائے گا۔

منصبی و افادی تعلیم پر تاکید

جمہوری اقوام میں یہ خیال عمومیت کے ساتھ پھیل رہا ہے کہ چونکہ ہر مرد و عورت کو سماج سے ذہنی اور اقتصادی مدد ملتی ہے اس لئے اسکا فرض ہے کہ سماج کو بھی مدد پہنچائے۔

اب لوگوں میں اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ محنت قابل ستائش ہے اور خدمت ایک اخلاقی فرض ہے۔ گزشتہ صدی سے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کی بدولت اُن تمام پیشوں نے جو صنعتی ہیں کافی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ صنعت اور تجارت اب گھریلو نہیں رہے بلکہ اُن کی حیثیت بین الاقوامی ہوگئی ہے۔ اور اُن میں بہترین دماغوں کی کاوش شامل ہے۔ تاجروں، ساہوکاروں اور بینک والوں نے زمینداروں کی جگہ لے لی ہے۔ سماج کی کشتی رانی انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ سرمایہ دار اور مزدور میں ایک خاص تعلق پیدا ہوگیا ہے۔ آجکل کی صنعت و حرفت نے نئی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ریاضی، کیمیا، طبیعات، نباتات میں خاص تحقیقات کی گئی ہے۔ اقتصادی انقلاب نے سائنس میں تازہ روح پھونک دی ہے۔ صنعتی پیشے دماغی کاوش چاہتے ہیں اور ان میں تمدن کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے لئے بھی سائنس کی تھوڑی سے واقفیت لازمی ہے تاکہ وہ لوگ کامیابی کے ساتھ کارخانوں میں کام کر سکیں۔ قدیم صنعتوں میں انفرادی علم کو بہت کم فروغ حاصل ہوا تھا، لیکن آجکل مشین چلانے والے (Operator) کو مشین کے مطابق

کام کرنا پڑتا ہے، مشین کو اس کی رائے کے مطابق استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیوی نے صنعتی و حرفتی تعلیم کو اسکولوں کے لئے ناگزیر خیال کیا ہے۔

سائنس کا علم تمام تر تجرباتی ہے۔ اسکا انحصار مطلق ادبیات پر نہیں۔ اس کی رو سے علم کے طور و طریقہ سے واقفیت زیادہ اہم ہے۔ عام مزدوروں کو دارالتجربہ کی تحقیق کی طرح کارخانوں میں تحقیق کی ضرورت نہیں، وہاں تو صرف ضرورت کے مطابق کام کرنا ہے۔ اسی بات کو مدّنظر رکھ کر ڈیوی نے اسکولوں میں ایسے مشاغل مہیا کرنے کو لازمی خیال کیا جن سے بچے مشینوں، کارخانوں اور سائنس کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیں۔ بچوں کو یہ تمام تعلیم بتدریج دی جائے تاکہ وہ کھیل کود کی طرح اُس کو بآسانی حاصل کر لیں۔ انواع و اقسام کے معلومات کا ذخیرہ مہیا کرنا اور بچوں کے دماغ میں اُن کو عملی طور پر ذہن نشین کرنا اسکولوں کا فرض ہے۔ اس طرح بچوں میں ذوقِ عمل پیدا ہوگا، اسکول اور خارجی زندگی میں باہم ربط و تعلق قائم ہو جائے گا۔ یہاں پر ڈیوی نے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس تعلیم کو تجارتی تعلیم خیال کریں جس سے بچے آئندہ زندگی میں مخصوص پیشہ اختیار کرنے کے

لائق ہو جائیں۔ ڈیوی نے بتایا ہے کہ اس تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جس سے ہر فرد معاشرہ کا لائق ممبر بن سکے، ہر فرد اپنی زندگی خود اختیاری طور پر بسر کر سکے اور دوسروں کا محتاج اور دست نگر نہ رہے۔ اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکے

افلاس و غربت مصیبت کے مترادف نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ رجحان طبیعت کے خلاف غلط پیشے اختیار کرتے ہیں، جن میں وہ کسی قسم کی سرگرمی اور انہماک ظاہر کرنے سے معذور رہتے ہیں اور ان کے دلوں میں فرط و انبساط کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا نصب العین صرف روپیہ کمانا رہتا ہے، ان کا دل کہیں اور دماغ کہیں رہتا ہے۔ ڈیوکیشن کا محدود نظریہ ان تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کی رو سے مزدور، سرمایہ دار، اور آقا و غلام کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے، جو افراد کی ترقی میں سدِ راہ ہوتی ہے۔

وہ تعلیم جو پیشہ کی ذہنی و سماجی اہمیت کی معترف ہے وہ اسکولوں میں گزشتہ واقعات کی روشنی میں موجودہ تعلیم کی گتھیوں کو سلجھائے گی، سائنس کی تعلیم دے گی تاکہ ذہانت تیز ہو اور پیش قدمی کا مادہ پیداواری (Production) میں

معین ہو۔ حالات عصریہ سے واقفیت کے لئے معاشیات، مدنیات (Civics) سیاسیات اور معاشرہ کی اصلاح کا مطالعہ لازمی ہے۔ ان تمام باتوں کے حاصل ہونے سے بچوں میں جدید حالات کے مطابق آراستہ ہونے کی کافی صلاحیت پیدا ہو جائیگی اور کورانہ تقلید کے بجائے اختراعی قوت نمودار ہوگی اور انجام کار ہماری سماجی تشکیل کا انحصار ایک نئی تعلیمی تعمیر پر ہوگا۔

باب پنجم

جان ڈیوی کے فلسفہ کا ماحصل

ڈیوی کے نظریۂ تعلیم میں صنعتی انقلاب کا پرتو اور ارتقاء جمہوریت کا انعکاس ہے۔ اس میں قدیم یونانی طرزِ تعلیم، اور اس شاہانہ زمانہ کے تحکمانہ طریقوں کا دخل شامل ہے جب تعلیم کا مقصد صرف چند اشیاء کے متعلق بات چیت کرنے کا سلیقہ تھا نہ یہ کہ ان پر کس طرح عمل کیا جائے۔ کھیتوں سے کارخانوں کی طرف روانگی، مشینوں کی بہتات، شہری زندگی کی ترقی و

کشمکش نے ایک نئے نصاب تعلیم کی ضرورت محسوس کی جس میں صنعتی و حرفتی زندگی کے مشاغل، تربیت، اور دستور العمل کو مرکزِ تعلیم بنایا جائے۔ ڈیوی نے عملیت کی اس وکالت کی بنیادوں پر اپنے فلسفۂ آلیت[1] کی عمارت تعمیر کی ہے اور امریکی فلسفہ کو جرمن نظریۂ علمیات[2] کی بے ثمر محکومیت سے آزاد کرانے کی جدو جہد کی ہے۔ اُس نے جرمن عینیت (Idealism) کی بنیاد پر اپنے فلسفہ کی عمارت تعمیر کی ہے اور اُس کے خیالات پر ولیم جیمس کے فلسفہ کا گہرا اثر پڑا ہے۔ یہیں سے ذکاوت کی قدر ڈیوی کا ایک لازوال احساس بن گئی ہے۔

اُس کے سلسلۂ خیال کا نقطۂ آغاز جیاتیاتی ہے وہ انسان کو ایک ماحول میں مثل ایک نظام کے تصور کرتا ہے جس میں مخلوق ہونے کے باوجود از سرِ نو تعمیر کرنے کی قوت و صلاحیت بھی موجود

---

[1] فلسفۂ آلیت (Instrumentalism) یہ عقیدہ کہ خیالات تاثرات اور تفادق کے آلات ہیں اور اُن کی حقیقت کو ان کی تاثیر سے جانچنا چاہیئے۔

[2] علمیات (Epistemology) یعنی وہ علم جس میں خود علم کے سرچشمہ، اُس کی صحت، ماہیت اور اُس کے حدود وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس نظریہ کے مبلغ و علمبردار کانٹ (Kant) اور ہیوم (Hume) تھے۔

ہے ۔ اشیاء اپنی اصل اور افعال سے معلوم کی جاتی ہیں جن میں مافوق الفطرت امور کو مطلق دخل نہیں ہوتا ۔ یہاں تک کہ شوپنہار کا خواہش زلیست (Wille) [۵۱] اور برگساں کا قوتِ حیات (Elan Vital) [۵۲] وہ متصوفانہ مفروضے ہیں جن سے ایک فلسفی ہمیشہ احتراز کرے گا ۔ تجربہ ہی فقط حقیقت ہے اور تمام تجربے اشیاء کے باہمی تعلق پر مبنی ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ چیزیں

۵۱ شوپنہار (۱۷۸۸ء ۔ ۱۸۶۰ء) ارادیت اور قنوطیت کا مبلغ اور علمبردار ہے ۔ جس طرح اس کے معمر ہمعصر ہیگل نے حقیقت اولی اور عقل کو ایک خیال کیا ہے ، شوپنہار اس کے برعکس حقیقت اولی اور خواہش کو مرادف جانتا ہے ۔ اس نے بھی اس بات کا دعوی کیا تھا کہ وہ کانٹ کے فلسفہ کی تکمیل اور پختگی کر رہا تھا کیونکہ کانٹ نے ڈیکارٹ اور اپنے پیشروؤں کی طرح خواہش کے افضلیت کی حمایت کی ہے جو تمام اخلاقی فلسفہ (اور اخلاقی اصول موضوعہ) کی اساس ہے ۔ شوپنہار کی نظر میں خواہش ہی تنہا حقیقت ہے نیز وہ عالمگیر ہے یعنی وہ خواہش عام ہے (جو کانٹ کے شعور عمومی اور جرمن عینیت کے مشابہ ہے) حقیقتاً اس دنیا میں کوئی شے اور خواہش انفرادی نہیں ہے کیونکہ انفرادیت زمان و مکان کے اختلافات سے وابستہ ہے ، اور جیسا کہ کانٹ نے بتایا ہے یہ اختلافات خود اشیاء کا جزو اصلی نہیں بلکہ صرف ان کے ظہور کی شکلیں ہیں ۔ پس انفرادیت فریب محض ہے ۔ علاوہ بریں شوپنہار کانٹ کے اس سیچی نظریہ سے متفق ہے جس کی رو سے خواہش لازماً شر ہے ۔ وہ خواہش ہے کسی طرح زندہ رہنے کی اور علم یا عقل صرف ایک آلہ ہے ، جس کو اس نے اس لئے ایجاد کیا ہے تاکہ وہ اپنے ہی بڑے انجام میں معاون ہو (یعنی عقل خواہش کے ماتحت ہے اور جو خواہش پوری کرنی ہوتی ہے

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۶)

صرف اس طرح جانی جاتی ہیں کہ وہ جانی ہوئی ہیں۔ لیکن اگر اس علم کو حقیقی ہونا ہے تو عملی ہونا لازمی ہے نہ کہ خیالی و تصوری۔ اس کو اشیاء کا مجرد و ذہنی پہلو اتنا نہ دیکھنا چاہیئے جتنا کہ ہماری جیتی جاگتی دنیا کے تجربہ میں

(بقایا صفحہ ۱۱۵) اس کے لیئے استدلال گھڑے جاتے ہیں) لیکن خواہش زیست ـ WILL (to Live) کو آسودہ کرنے کا کوئی سرچشمہ نہیں۔ کسی آرزو کو آسودہ کرنے کے لئے تمام تکلیفیں برداشت کرنی ممکن نہیں کیونکہ کسی ایک آرزو کا آسودہ کرنا دوسرے آرزو کی ابتدا کرنا ہے اور اس کی جستجو لا متناہی ہے۔ پس زندگی غم آلودہ جد و جہد کا مجموعہ ہے، اور غیر آسودہ خواہش جس کا پلہ اطمینان اور خوشی کے اوقات سے زیادہ بھاری ہوتا ہے، اسکا علاج بودھ کی طرح انکارِ نفس اور نروان میں ہے۔ الغرض ہم کسی چیز کی خواہش اس لئے نہیں کرتے کہ ہمارے پاس دلائل و براہین موجود ہیں۔ بلکہ ہم اس لئے دلائل پیش کرتے ہیں کہ ہمیں اس چیز کی خواہش ہے۔ ہم اپنے خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فلسفہ و دینیات کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ عقل صرف وزیرِ خارجہ ہے اور فطرت نے اسے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ انفرادی خواہش کی خدمت کرے۔ خواہش دماغ کا ایک دوامی اور غیر متبدل عنصر ہے۔ وہ خیال کا سرچشمہ ہے۔ عقل تھک جاتی ہے لیکن خواہش کو کبھی تکان نہیں ہوتا۔ عقل کو آرام کی ضرورت پڑتی ہے لیکن خواہش نیند کی حالت میں بھی اپنا کام جاری رکھتی ہے۔

۵۳ ہنری برگساں (۱۸۵۹ء تا ۱۹۴۱ء) کی نظر میں تغیر اور انقلاب کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ زندگی تغیرات کی ایک لڑی ہے۔ لیکن ہماری قوتِ مدرکہ ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ وہ غیر مربوط حالتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ علاوہ بریں خارجی حواس بھی ہمیں دھوکا

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۷)

اُن کے حقیقی طریقِ عمل اور رابطہ کو دیکھنا چاہیئے۔ خیال (Tholgnt) تاثرات کا آرگن ہے، وہ رَوَیّہ و کردار کا آلہ ہے نہ کہ علم کا جیسا کہ قدیم خیال تھا۔ ہر خیال (Idea) کو پُر معنی بنانے کے لئے حقیقی محرکات و مواقع کے ساتھ خصوصیت سے میل جول کرنے کا ایک طریقہ ہونا چاہیئے (یہاں پر ڈیوی نے مبالغہ میں پڑے ہوئے بغیر نظریہ کردار کی پیش بینی کی ہے)۔

قوتِ فکریہ کے عمل کا آغاز مقدمات سے نہیں بلکہ مشکلات سے ہوتا ہے۔ اسکا انجام یقین پر نہیں بلکہ اس مفروضہ دعویٰ پر ہوتا ہے جس کی تصدیق تجربہ کے منشور سلطانی سے کی جاسکتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک خیال (Idea) پورے طور پر سچا ہے کیونکہ وہ تجربہ کو

(بقایا صفحہ ۱۱۶) دیتے ہیں۔ کیونکہ انکا مقصد ہمیں حقیقت کا علم عطا کرنا نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہماری قوتِ مدرکہ زندگی کے اُن مظاہر سے سروکار رکھتی ہے جن کو زمانِ مسلسل اور مکان کہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت کا انکشاف ہمارے شعور کی وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم بذریعہ "وجدان" معلوم کرسکتے ہیں۔ اور وجدان زمان مسلسل میں نہیں بلکہ زمان خالص میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت جسکا علم اس طرح حاصل ہوتا ہے ایک تخلیقی تحریک ہے جسے بالفاظ دیگر تخلیقی انقلاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک زبردست ہیشر و حرکت ہے اور ہر شئے کو اپنے ساتھ ارتقائی رنگ عطا کردیتی ہے لیکن اسکا راستہ بالکل غیر معین ہے اور زمانہ آئندہ میں کوئی مقصد اُس سے وابستہ نہیں ہے۔

روشن کرنے اور آرزو کے حاصل کرنے کا ایک موثر آلہ ہے۔ خیال (Thought) کا مقصد صرف دنیا کا سمجھنا نہیں ہے بلکہ اس پر دسترس حاصل کرنا اور اس کی از سر نو تشکیل کرنا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کے تعلیمی نظریہ "فرد کو اپنے ماحول کے مطابق بننا" کی جگہ عمل تعلیم کو لینا چاہیئے جس کی رو سے ایک فرد میں اُن تمام فطری قوتوں کی نشو و نما اور تکمیل ہو جو اس کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے ماحول پر قابو پا سکے اور امکانات کی جگہ یقینیات کو دے سکے۔

اس کے علاوہ چونکہ ہر ایک فرد کو معاشرہ کے اندر رہ کر زندگی بسر کرنی ہے اس لئے سماج کا مطالعہ بحیثیت ایک شہری کے کرنا ناگزیر ہے۔ وہ شہری جو تفاعلات (Interactions) اور روابط کی بے پایاں پیچیدگیوں میں بڑھنے والا اور سوچنے والا ہے نہ کہ وہ جو بحیثیت ایک تارک الدنیا (راہب) اور بے یار و مددگار انسان کے زندگی بسر کرتا ہے۔

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست   زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم

تعلیم، تربیت اور ہزاروں قسم کی تحریکاتِ ذہنی کے ذریعہ سے وہ شہری اپنے ہمسروں کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور اس کی قوتِ فکریہ بڑی حد تک اسی کے ذریعہ سے اُن کی قوتِ فکریہ ہو جاتی ہے۔

اگر ایک طرف یہ قوت فکر یہ اس کی انفرادیت کو کم کر دیتی ہے تو دوسری طرف اس کے ممکن نشوونما کے حدود کو اس سے کہیں زیادہ وسیع کرتی ہے جتنا کہ وہ قدیم نظریہ غیر تبدل وراثت سے جکڑے ہوئے تھے۔ تعلیم میں یہ ایمان رکھنا کہ وہ سماجی، سیاسی اور اخلاقی نئی تعمیر کا مستحکم ذریعہ اور آلہ ہے اس کی تائید جبلتوں کی اثر پذیری اور انسانی نشوونما کی بے پایانی سے ہوتی ہے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ ہماری آجکل کی مشکلات کا باعث عنفوان شباب کی درہمی و برہمی اور ہماری قوتوں اور عقل کے درمیان عدم تناسب ہے۔ وہ اپنی کتاب "ڈارون کا اثر فلسفہ پر" صفحہ ۱۷ میں (جس کا موجودہ مفکرین پر گہرا اثر پڑا ہے) لکھتا ہے "فی الحال علم الطبیعہ (Physical Science) علم النفس (Psychical Science) سے کافی سبقت لے گیا ہے۔ ہم نے مادی نظام پر اتنا قابو پالیا ہے کہ اشیاء کی معقول مقدار پیدا کر سکیں لیکن ہم نے اُن حالات کا علم حاصل نہیں کیا جن سے ممکن قدریں زندگی میں حقیقی ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اب تک عادت، اتفاق اور قدرت کے پنجے میں گرفتار ہیں . . . .
تسخیر فطرت کی روز افزوں ترقی سے اور فطرت کو انسانی فائدے

اور تسکین کے لئے استعمال کرنے کی لیاقت سے ہم کو انجاموں کا حقیقی حصول اور اُن قدروں کا لطف حاصل آتا ہے جن کی ترقی غیر یقینی اور غیر اختیاری ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تضاد کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ جتنا ہی زیادہ ہم وسائل کو بڑھائیں گے اتنا ہی کم یقینی اور عام فائدہ ہم اُن سے حاصل کر سکیں گے"

انسان کی از سرِ نو تعمیر کا انحصار، تاکہ اُس کی ذہنی اور اخلاقی سطح، اُس توسیع کی ہوئی پیچیدہ دنیا کے مطابق ہو جس کو اُس کی اختراعات و ایجادات نے ڈھانپ رکھا ہے، جمہوریت اور تعلیم پر ہے۔ جمہوریت صرف ووٹ دینے کا نام نہیں، بلکہ مساویانہ موقع بہم پہنچانا، تعلیمی دنیا میں برادرانہ شغل و عمل کرنا، صنعت و حرفت میں استبداد کے بجائے ارادی میل جول کا وجود، بیرونی تعلقات میں جنگ و جدل کی جگہ مشاورت و قانون کا قیام ہے۔ تعلیم صرف نظری نہیں ہے، بلکہ مخصوص اور تجربی غور و فکر سے وابستہ ہے۔ ہماری سماجی بیماریوں کا علاج اب انفرادیت و اشتراکیت، مقابلہ و اتحادِ عمل، آمریت و جمہوریت سے نہیں ہو سکتا بلکہ مقررہ اصول کے مطابق تحقیقات، معین

تحلیل، پھر احتیاط ضابطہ سازی، متحملانہ تجربات کرنا، اور بتدریج نئی درستی وغیرہ ہی سماج کے علاج کا ذریعہ ہیں۔

ذکاوت ایک بڑی ضرورت ہے اور سقراط نے اس کو اہم ترین فضیلت خیال کرنے میں زیادہ غلطی نہیں کی۔ نیز ذہانت اور فطانت وہ نہیں جو حقیقی اور مقررہ خیال کے مخالف ہو بلکہ وہ دماغ کا لوچدار ہونا ہے تاکہ گزشتہ تجربات کو نئے محرکات و مقاصد کے کام میں لایا جاسکے۔ اس دنیا میں نہ تو کوئی خیر محض ہے اور نہ کوئی اہم نیکی۔ اخلاقی نصب العین کا اختلاف فرد اور زمان و مکان سے ہونا ضروری ہے اور صرف ذکاوت ہی ٹھیک اور عارضی طور پر اس کی تحدید کر سکتی ہے۔ صرف ایک ہی چیز عالمگیر خیر معلوم ہوتی ہے اور وہ نشوونما اور ترقی ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے "حیات انسانی کا منتہائے مقصود اکملیت نہیں بلکہ تکمیل، پختگی شائستگی اور پاکیزگی کے حصول میں پیہم جدوجہد کرنا ہے۔ برا آدمی وہ ہے جس میں باوجود گزشتہ اچھائیوں کے اب انحطاط کے آثار نمایاں ہونے لگیں اور وہ سماج کے لئے کم مفید ثابت ہو۔ اچھا آدمی وہ ہے جس میں باوجود گزشتہ اخلاقی برائیوں کے فضائل و محاسن میں ترقی کرنے کی سرگرمی اور جدوجہد پائی جائے۔

ایسا نظریہ ایک انسان کو اپنی ذات پر نکتہ چینی کرتے ہیں سخت گیر بنا دیتا ہے اور دوسروں کی سیرت کا اندازہ کرتے ہیں کریم النفس[۵] ۱۹۰۴ء میں جب ڈیوی کولمبیا یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کا صدر مقرر ہوا تو اسکا اثر تعلیمی دنیا سے باہر زمانہ کے فلسفیانہ اور عمرانی خیالات پر پڑا۔ امریکہ کے اطراف و جوانب سے طلبا جوق جوق علم کی پیاس بجھانے کے لئے اُس کے درس میں زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ طلبا کے دلوں پر اُس کے لکچروں کا اثر بہت گہرا ہوا۔ وہ اپنی تحریر و تقریر اور شاگردوں کی وجہ سے پڑھنے والے امریکی دماغوں کے لئے حقیقی اور عملی کیف کا سرچشمہ بن گیا ہے۔

---

۵۱ فلسفہ کی تعمیر نو صفحہ ۱۷۷ (Reconstruction of philosophy

ص۲۲۲
(ح ف)

۳۷۰۵۱

DUE DATE

۱۳۳۰ ۵۵